

پہلا دور کا کمال

قاریہ انصاری

hundu.com

پہلا دور



Urdu.com



”پھلاں دے رنگ کالے“ میرے تخلیقی سفر کے ابتدائی دور کی تحریر ہے اور میری پسندیدہ ترین تحریروں میں سے ایک اسی لیے جب ادارہ خواتین ڈائجسٹ نے میری تحریروں کو کتابی شکل میں لانے کا ارادہ ظاہر کیا تو میں نے خود اپنی ناول تجویز کیا۔

اس ناول کے بارے میں ایک دلچسپ بات بتاتی چلوں کہ اس کی کہانی واقعات سب بے شک فرضی ہیں مگر کردار تقریباً ”حقیقی“۔ بسم اللہ جان، حضرتی، ڈاکٹر خوشنود، غٹ شنڈے، رحیم گل، ارباب خٹک۔ یہ میرے بچپن کے ہمدیکھے بھالے کردار ہیں جنہیں میں نے اس یقین کے ساتھ اس کہانی میں مدغم کیا ہے کہ یہ ناول ان کی نظروں سے کبھی گزرے گا ہی نہیں۔ ان میں سے بیشتر آنکھیں اب ابدی خند سوچتی ہیں۔ دوسری اہم بات جو اس ناول کو میری نظروں میں اہم بناتی ہے وہ یہ ہے کہ اس سے قبل میں نے کبھی طویل تحریر لکھنے کا حوصلہ نہیں کیا تھا۔ میں طبعاً ”رکھی“ نہیں ہوں اور کچھ کچھ سل پسند بھی ہیں لیکن اس کہانی نے خیر اپنا آپ مجھ سے لکھوایا اور مجھ میں یہ اعتماد بھی پیدا کیا کہ اگر میں چاہوں تو خود چپکاست اور سہل پسند کا ایسا ناول لکھ سکتی ہوں۔

اس ناول میں میرا سب سے پسندیدہ کردار ”سویمندر“ کا ہے۔ جس نے کوشش کی ہے کہ اس کے کردار کی ان تمام خوبیوں یا خصوصیات کو ٹھیک اس انداز میں قارئین تک پہنچا سکوں جس طرح انہوں نے نئے مٹاثر کیا اور لکھنے اسایا۔

مجھ سے گنے والوں نے اکثر پوچھا ہے کہ میری کہانیوں کا مرکزی کردار زیادہ تر مرد کیوں ہوتا ہے۔ اس سوال کا جواب تو مجھے بھی نہیں معلوم البتہ اتنا ضرور ہے کہ میں نے ایسا کبھی ارادہ نہیں کیا۔

یہ سچ ہے کہ میرے تخلیق کردہ کرداروں میں سب سے مضبوط اور تاثر انگیز کردار ہوتے ہیں اور ان بست سے کرداروں میں سے ایک ”ناشر ملک“ ہے۔ ”سارے گلاب لے جاؤ گے ناشر ملک“

ناشر ملک کی مادرائی کردار نہیں ہے نہ ہی کوئی مثالی مرد۔ وہ اس معاشرے کا ایک عام مرد ہے۔ بہت سی ذہانت و جاہت، کشش کے ساتھ ساتھ وہی روایتی لہنگے رکھنے والا ایک مرد جو اپنے آگے کسی کو دیکھ نہیں سکتا۔ بالخصوص کسی عورت کی۔ جو رقابت کی آگ میں اپنے سگے رشتوں کی بھی بخشش نہیں کرتا۔ ایسا مرد جو عورت کی کسی لغزش کو معاف کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتا۔ ایسا مرد جس کی عورت اس کے بارے میں وہی فرسودہ نظریہ رکھتا ہے لیکن اس بہت عام سے مرد کے اندر کہیں ایک بہت خاص بات بھی موجود ہے جسے میں نے بھارتیوں کی کوشش کی ہے۔

اور یہی نام ہے خاص اور خاص سے خاص تر بننے کا کیا ہے۔ یعنی خود اکتسالی کا عمل اس عمل سے گزر کے ہی ناشر ملک میری کہانی کا ہیرو بناؤرنہ ابتدا سے اختتام سے ذرا پہلے تک اس کا نام ہونا چاہیے تاکہ برقرار رہا۔

آپ کو یہ کردار نام لگتا ہے یا خاص اس کا فیصلہ آپ کریں گے۔ میرا کتابی شکل میں چھپنے والا پہلا ناول آپ کے ہاتھوں میں ہے اور اب یہ آپ کی مرضی ہے کہ آپ کس کردار کی کن صفات میں اپنی پسندیدگی بھاتے ہیں۔

ناشر: انتشار لاہور

پھلاں دے رنگ کالے

اچھے نصاب چھٹیوں کے بعد وہ جو یادیں اگلے کے اس گھر سے رخصت ہوئی تھی، وہی سر روئے اس بار بھی اہلی کے استقبال کو موجود تھے، کچھ بھی تو نہ بدلا تھا، وہی بی بی جان کی برقی تیز سے چھتوئی نکا ہیں، وہی چچی جان کا ڈھوپ چھاؤں سا مزاج، وہی تانی امی کا لائق سارویہ، وہی کزنز کا گریز اور وہی درو دیوار کی اجنبیت، باچا جان کی طبیعت میں بھی اسے کوئی خاص تبدیلی محسوس نہ ہوئی۔ وہ جب بھی چھٹیوں میں گھر آتی انہیں بستر پہ اسی طرح موت کی آ نہیں سنتے دیکھتی۔ کوئی نہ کوئی نرس ان کی ڈرپ چیک کر رہی ہوتی اور ہانکی کوئی بہو یہ تبصرہ کر رہی ہوتی۔

”بابا جان اس بار بچتے نہیں لگتے، خدا خیر کرے۔“ اور خدا برسوں سے خیر کرتا چلا آ رہا ہے۔ لیکن پارٹ ٹیک، کینسر اور شوگر کے ہر مرحلے کے بعد بچ جاتے تھے اور اگر نہ بچتے، تو زبانی سے چند ٹونے پھونے لفظ بھی ادا کر لیتے۔ نے ان کا نچلا دھرتی مظلوم کیا ہی تھا، تو تے گویائی بھی مٹا کر تھی۔ اس بار بھی شاید طبیعت کچھ بہتر تھی، ساری اولاد کے اکٹھا ہونے پر انہوں نے وکیل کو بلوا کر وصیت تیار کروائی تھی۔

وہ عمر کے اس حصے اور صحت کے اس مرحلے پہ تھے کہ ان کا وصیت تیار کرانا کوئی ایسی غیر معمولی بات بھی نہ تھی۔ انہوں نے تو یہ ہوئی کہ انہوں نے تمام اولاد میں برابر ترکہ تقسیم کرنے کے بعد اولاد کی اولاد میں سے صرف ایک پوتی مقدس زریاب کو امتیازی حیثیت سے اپنے پرسنل اکاؤنٹ اور خاندانی نوادرات و زیورات کا وارث قرار دیا۔

اکاؤنٹ کے بارے میں تو وہی بہتر جانتے ہوں گے، البتہ نوادرات و زیورات کا تخمینہ لاکھوں نہیں کروڑوں میں لگایا جا رہا تھا۔ اگرچہ انہیں بیچنا خاندانی حرمت و وقار کے منافی تھا

لیکن بڑی بات تو یہ تھی کہ نسلوں سے یہ ترکہ خاندان کے بڑے بیٹے کی ملکیت میں چلا آ رہا تھا۔ یہ ایک غیر تحریری آئین تھا جس کی زد سے تاجا جان افراسیاب خٹک اس کے امین تھے اور باچا جان نے بڑے اور چھوٹے بیٹے کو چھوڑ کر خاندانی عظمت کی یہ نشانیاں اپنی پوتی کو سونپنے کی وصیت کی تھی، ایسی پوتی جس کی حیثیت ہی اس خاندان میں مشکوک سمجھی جاتی تھی۔ نفرت، کراہیت، گریز، لالچاتی کے وار تو بچپن سے سہتی چلی آ رہی تھی باچا جان کے ہنٹلے بیٹے زریاب خٹک کی اکلوتی اولاد مقدس، اب عداوت بھی اس کے نصیب میں لکھ دی گئی تھی۔

☆☆☆

”داؤ، کتنی پیاری ہے ناں سانتھا، بالکل سنڈریا جیسی۔“

فارحہ نے لیٹ ایڈیشن لینے والی اپنی نئی فرینچ کلاس فیلو کو دیکھ کے کوئی چوتھی بار کہا۔ اس سے قبل وہ اسے دیکھ کے سنووائٹ اور باربی ڈول کے خٹک بچے کی بے چلکی تھی۔ یہ لپٹاؤ سب سے مشہور کا نوٹ تھا جہاں اکثر ممالک کے سفارت کاروں کے بچے زیر تعلیم تھے۔ ”سنڈریلا اتنی موٹی نہیں تھی، تم نے اسٹوری بک میں دیکھا ہے کیا؟“ بیابان نے چاکلیٹ سے چپکتے ہاتھ ٹشو سے پونچتے ہوئے رشک و حسد کے بیٹے جیلے تاثرات کے ساتھ کہا۔ انگلش، جرمن، فرینچ فیملیز کے بچوں کو ملنے والی توجہ سے وہ اکثر جلیس رہتی۔ ”اور کیا، وائٹ پبلیکشن ہونے سے ہر کوئی سنووائٹ نہیں ہو جاتا۔ ہماری مقدس سے زیادہ کیوٹ نہیں ہے وہ سانتھا۔“ شاور ہمیشہ کی طرح اپنی فوری فوری کے سٹلے میں بانہیں ڈال کے اسے گفتگو میں کھینچ لاتی۔

”لیکن وہ فارنر ہے۔“ فاریہ اپنے پوائنٹ پیز زور دیتے ہوئے بولی۔

”تو کیا ہوا؟“ شاور چبا چبا کے بولی۔ ”مقدس کی مدر بھی فارنر تھیں۔“

”رہی؟“ نوعمر کی بچیوں کا وہ پورا گروپ مارے ایسا ٹوٹا چلا۔

مقدس حیرت سے گنگ بنی شاور اپنی پھوپھی زاد کو کھتی رہی۔ خود اس کی نو سالہ زندگی میں یہ پہلا انکشاف تھا اس کی ماں کے بارے میں۔

”آئی سویٹر، میں نے خود سنا ہے۔“ وہ مقدس کی طرف بٹنی۔

”یاد ہے جب ہم اسلام آباد بڑے ماموں کے ہاں گل ریز کی برتھ ڈے پارٹی کے لیے گئے تھے، وہاں نانا شادا کی اسکول فرینڈز بھی آئی تھیں انہوں نے آپ سے کہا کہ ویسے تو تم سبھی کرنز پر بیٹی ہو مگر اس لٹل گرل کے فچرز بہت شارپ ہیں اور لک بھی انگلش ہے تب تانی آپ نے کہا کہ اس کی مدر یعنی ہماری آنٹی فارنر تھیں اور ماما کہتی ہیں مقدس ہو بہو اپنی مدر جیسی ہے۔“

اور یہ تھا پہلا تعارف اس کا اپنی ماں سے۔ کتنا عجیب سا لگتا ہے کسی ایسی بچی کے بارے میں یہ سننا، جو آج کے الیکٹرانک دور میں میڈیا کی بدولت اپنی عمر سے دس گنا زیادہ میچور سوچ رکھتی ہو، جو ایک بھرے پرے خوش حال کنبے میں پرورش پا رہی ہو، لیکن نو برس کی عمر میں پہلی بار اس نے اپنی ماں کا ذکر سنا، وہ چاہے اس کی ماں مر ہی کیوں نہ گئی ہو۔

شاور اس کی واحد دوست، جس کے قریب آنے کی واحد وجہ بھی یہی تھی کہ وہ بھی اس کی طرح ماں سے محروم تھی۔ لوریوں سننے کی عمر میں جب شاور اپنی ماں کے بارے میں فرضی قصے گھڑ کے سنایا کرتی کہ کل رات ماما پر یوں کے سے سنہری پرگ کے گھڑ کی کے راستے میرے کمرے میں آئیں اور مجھے ڈھیر سا پیار کر کے گئیں تو وہ ادھر ادھر دیکھنے لگتی۔

شاور کے پاس اس کا باپ تھا جو جب بیٹی اپنے مرنے آتا اپنی شریک حیات کی یادیں تازہ کرتا، مانی تھی جو تو اسی کو گود میں بٹھا کے بیٹی کے لپٹن کی شرارتیں سناتی اور ہنستے ہنستے رو پرتی، ماں کی تصویر تھی جو اس کے بستر کے سر ہانے پہ ایک دعا کی طرح آویزاں تھی۔ جب کہ اس کے پاس کیا تھا، ماں کی ہلکی سی شبیہ بھی نہیں تھی جس کے سہارے وہ اس کا سراپا تراشتی، نہ ہی باپ کی زلفات جو اس سے اس کی ماں کی باتیں کرتا، نہ ہی ماں کے حوالے سے کوئی اور قریبی رشتے جو تو اسی کے نقوش میں بیٹی کی پرچھائیں تلاشتے۔

اور گھر اس گھر کے مین اس کی ماں کا نام تک نہیں لیتے، اسے مکمل فراموش کر چکے ہیں تو یہ سب کی بات نہیں۔ وہ ایک زندہ وجود لیے ہوئے بھی اس عالی شان گھر میں اپنے بچوں کا احساں لانے میں ناکام ہے تو غیر موجود لوگوں کی بساط ہی کیا۔

مقدس نے اپنے بچوں کو لیتے ہی اپنے ارد گرد رشتوں کا جھوم دیکھا، دل کا نہ سہی مگر بچوں کے رشتوں کا۔ پچھلے دنوں کے لیے اس کا ہونا نہ ہونا ایک برابر تھا ویسے بھی وہ اپنی زندگی کے محبت اپنے بچوں تک کے زیادہ قریب نہ تھے، وہ اور ان کی زمیں، ان کی بڑی بڑی ٹوٹھوں اور لمبی لمبی گن رکھنے والے دوست، تاش اور شکار کی مٹھلیں، گھر میں وہ کم ہی نکلتے یا پھر اکثر سوائے ہوئے پائے جاتے۔ ان کی پڑھی لکھی اور گھر کے گھنے ماحول سے سدا کی بیزاریت، چچی جان جو بے حد موڈی سی تھیں، کبھی تو اپنے بچوں کے جھوم میں اس کا اور شاور کا بے ضرر سا وجود انہیں بے طرح کھٹکتا، بلاوجہ چڑجاتا تھا وہ ان دونوں کی موجودگی سے اور خصوصاً اس کے سامنے تو دبا دبا سا اظہار بھی کر دیتیں کہ اس سے زیادہ کھل کر بدتہذیب ہونے کی ان کی تعلیم اجازت نہیں دیتی تھی۔ البتہ شاور کو بی بی جان یعنی اس کی سگی نانی کی پشت پناہی حاصل تھی۔ اس کے سامنے و بجاتا ہی رہتیں۔ کبھی کبھی بخش بی بی جان اور ان کی لاڈلی نواسی کی چڑ میں مقدس پہ خاصی مہربان بھی ہو جاتیں۔ جو بھی تھا بہر حال انہوں

نے محبت و شفقت کے نام پہ نہ سہی، انسانیت اور خدا ترسی کے حوالے سے دونوں لڑکیوں کا مقدور بھر خیال ضرور رکھا۔

باچا جان سدا کے بیمار، اس نے ہوش سنبھالتے ہی انہیں بستر سنبھالتے دیکھا کبھی کبھی تو وہ اس قدر بیمار پڑ جاتے کہ سارا خاندان اکٹھا ہو جاتا، کئی اہم تقریبات ملتوی ہو جاتیں، کئی ضروری کام التواء میں ڈال دیئے جاتے اس خدشہ کے پیش نظر کہ کہیں خدا نخواستہ..... لیکن بڑی سے بڑی تکلیف کے بعد باچا جان بھلے چنگے ہو جاتے، ویسے بھلے چنگے کہنا تو غلط ہوگا یوں کہیں موت کو نال کے واپس آ جاتے۔ انہیں اپنے کمرے سے نکلے کئی برس بیت چکے تھے۔ بی بی جان تمہیں، باچا جان کی دوسری بیوی، انتہائی طرح دار اور حسین خاتون، نہایت کم عمری میں شادی ہو جانے کی وجہ سے یہ پٹھان زادی، دادی اور تانی بننے کے باوجود اڑتیس، چالیس سے اوپر کی نہ لگتی تھیں۔ جب کہ باچا جان انہیں خالصتاً اپنے لیے لگتے، چچی جان انہیں بی بی جان اتنی بھی کم عمر نہیں، پچاس کے قریب ہیں۔ بس ویسے ہی عمر بھرنے کیوں بن گئی ہے۔ بالوں کو سفیدی چھو کے گزر گئی، بس چند تاروں کی جھلک ہے۔ بہت سرب، نیلی بلور آنکھوں میں چنگاریاں پھوٹتیں اور باریک سرسبز لب سے ایک دوسرے میں پیوست رہتے جیسے کوئی اہم راز اس قید سے باہر نکلنے کو بے تاب ہو اور اسے جبراً سینے میں دبا دیا گیا ہو۔ مقدس کو سامنے پا کے یہ چنگاریاں کچھ اور بھڑک اٹھتیں اور لب زیادہ بھنچ جاتے۔ وہ کم ہی اسے مخاطب کرتیں۔ اس کے لیے ان کے رویے میں اتنی تپش جھلکتی ہوئی، یا خشک ہوتی ہڈیوں میں خوف جمانی ہوئی۔

چچا جان اور مرحومہ پھوپھی بی بی جان کی سگی اولاد تھے۔ پھوپھی شادی کے ایک سال بعد ہی شاد کو جنم دیتے ہی مر گئیں وہ اور شاد تقریباً ہم عمر تھیں۔ جب کہ دراب بچا کی انوشہ اور پلو شہ ان سے ڈیڑھ دو سال چھوٹی تھیں۔ ان جڑواں بہنوں کے پر تین بیٹے تھے۔ اس کے سگے تایا افراسیاب خشک اور بابا جان دونوں بھائی بی بی جان کی مرحومہ سوکن کے بیٹے تھے۔ جنہوں نے انہیں ماں جیسی ہی عزت دی۔

تایا جان اپنی نیلمی کے ساتھ اسلام آباد سہل تھے وہ کچھ سیاست وغیرہ کا شغل رکھتے تھے مقدس کے ساتھ ان کا رویہ بھی کچھ مختلف نہ تھا۔ انہوں نے کبھی انظر بھر کے بھی سگے ماں جانے کی اکلوتی اولاد کو نہ دیکھا۔ اس کے سلام کا جواب بھی وہ بے رغبتی سے منہ پھیر کے دیتے اس کے علاوہ اس کی کبھی ہمت نہ ہوئی ان سے بات کرنے کی، اگر کبھی بھولے بھٹکے ان کی نگاہ اس پہ پڑ بھی جاتی تو سرخ و سفید چہرہ دیکھنے لگتا۔ بڑی بڑی بادامی آنکھیں لبورنگ ہو جاتیں اور وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتے باہر نکل جاتے حالانکہ مقدس کو تو انہیں اٹھتے بیٹھتے، بولتے، مسکراتے ہر

طرح سے دیکھتے رہنا بے حد پسند تھا۔ کیونکہ ہمیشہ سے اس نے یہ سنا تھا کہ اس کے بابا جان اور تایا جان میں خاصی مشابہت ہے۔ اگرچہ گھر میں اس نے اپنے باب کی کئی قد آور تصاویر آویزاں دیکھی تھیں لیکن تایا جان کی صورت وہ انہیں مجسم دیکھ کے دل کو تسکین دے دیتی تھی۔ جب کہ ماں، ماں کے حوالے سے وہ کوئی بھی ذکر سنتی تو تسکین کے بجائے عجیب سی وحشت دل کو گھیر لیتی۔ اسے یاد تھا ایک بار جب وہ پلو شہ اور شاد تانی آپ کی منگنی کی باتیں کر رہی تھیں۔

”کتنی خوب صورت لگ رہی تھیں آپ۔ میرا دل شرارے میں اور ان کی لانی گردن میں وہ گلوبند کتنا چ رہا تھا۔“ یہ پلو شہ کی رائے تھی۔

”اتنے سیک اپ اور جیولری کے ساتھ تو کوئی بھی خوب صورت لگے گا۔“ شاد کی مناشہ آپ کے ساتھ کم ہی بنتی تھی۔

”خیر ایسی بات بھی نہیں۔ وہ ویسے بھی خوب صورت ہیں۔ ہماری پوری نیلمی میں صرف ایک ہی ایسی لکھنیں اور بال بلیکٹ ہیں۔ یہ بھی ان کی انفرادیت ہے۔“ مقدس نے کھلے دل سے ریف کی۔

”واہ ایسے ہی، باقی کیا کم ہیں۔ ان سے تو تانیہ زیادہ اٹریکٹو ہے۔ میری بھی ہاسٹ کچھ کچھ ہے، لیکن خیر ابھی میری اتج بھی تو فٹن ہیں، تھوڑی سی ہاسٹ اور بڑھ جائے تو تمہاری آپ کی کیا لگی میرے آگے۔ تم دونوں بھی اچھی لگو گی، بڑی ہو کے بہت اچھی لگو گی دیکھ لیں۔“

مقدس نے پلو شہ کی باتیں سنیں انہوں نے پاپا سے سنا ہے، مقدس کی ماما بے حد خوبصورت تھیں، اسے پلو شہ نے انہوں سے سنا آج تک ایسی حسین عورت نہیں دیکھی، ماما کہتی ہیں ایسی تو پلو شہ نے ان کا لڑکھتی چاہتا ہے کاش انہوں نے بھی تمہاری ماما کو دیکھا ہوتا۔

”بی بی جان کو دیکھ رہی تھی۔ بلکہ انگوری رنگ کے چارجٹ کے شلوار تھیں چکن کی کریم کلر کی بڑی سی چادر اوڑھے وہ کسی قدر باوقار لگ رہی تھیں۔ سلیقے سے گندھے بالوں سے باریک شیفون کا دوپٹہ تھا۔ کانوں سے لنگی بالیوں کے ساتھ موہی کی تازہ آدھ کھلی کلیاں انکی تھیں۔

ان کی نگاہ اب تک مقدس پہ نہیں پڑی تھی، اس لیے چہرے کے نقوش بگاڑتے ہوئے تلخ تاثرات مابعد تھے۔ اس سے نجانے وہ کیوں اسے بہت اچھی لگیں، شاید اس لیے کہ اس نے کبھی کبھار ہی انہیں نفرت اور بے زاری کے بغیر دیکھا تھا، اسی لیے بے ساختہ کہہ اٹھی۔

”بی بی جان بھی تو کوئی پری ہی لگتی ہیں، اب بھی اتنی حسین ہیں تو پہلے کیا لگتی ہوں گی ہے ناں؟“

”دیکھئے بی بی جان، مقدس کیا کہہ رہی ہے۔“ شاور، سدا کی منہ پھٹ اور جذباتی، چلا اٹھی۔ اس کا مقصد محض بی بی جان کے دل میں کسی طرح اپنی دوست کے لیے جگہ پیدا کرنا تھی۔ وہ ان کے گریز اور سرد مہری کو ہمیشہ سوتیلے پن کی رعایت دیتی تھی۔ مقدس نے ان کا ہاتھ دبا کے مزید کچھ کہنے سے باز رکھنے کی کوشش کی، مگر تب تک وہ بی بی جان کو میٹرھیاں نیچے اتر کر آنے کی مہلت دیے بغیر شروع ہو چکی تھیں۔

”مقدس کو آپ اتنی پسند ہیں مجھے تو یہ ہی نہ تھا۔ میں تو سمجھتی تھی آپ کو سب سے زیادہ پیار میں کرتی ہوں، لیکن یہ کہہ رہی تھی کہ بی بی جان اتنی خوب صورت ہیں اتنی خوب صورت ہیں کہ جتنی اس کی اپنی ماما۔ اس کے لیے ددوں ہی۔“

بی بی جان کو پیش میں تیزی سے آگے بڑھتے دیکھ کے اس کی زبان گنگ ہوئی اور مقدس کسی انجانے جرم کے احساس سے سبھی نوزنی نامعلوم پہنچ گئی ہوئی۔ ”چٹا“ اگر محض جسمانی تکلیف کو ہی شہد کا نام لیا گیا ہے تو بے شک اس کا پندرہ سالہ زندگی کا یہ پہلا تجربہ تھا جو اسے ماں کے دل سے ملتا تھا۔ ”تیری اتنی جرات، تو میرا مقابلہ اپنی ماں سے کرے گی۔ ارے میں اسل خانہ کی عزت دار الحمد للہ بچی مسلمان، ساری عمر اپنے وقار کو سنہنت کر رکھتے گزر گئی۔ اور یہ اس حرافہ کی نشانی، مجھے بل بھر میں دو کوڑی کا کرگنی۔ میرا نام اس ہندنی کے ساتھ لے کر۔ وہ کافر کی اولاد اور میں اس بد بخت کی نظر میں ایک جیسے ہی ہوں۔ تم کہاں دیکھ لی تو نے اس ہندنی (ہندو عورت) کی کاٹی صورت، جو میرے ساتھ مقابلہ کرنے چلی ہے۔ کس نے بھونک دیا تیرے کانوں میں اس کے حسن کے بارے میں۔“

میں بتاتی ہوں تجھے اس کے کالے کرتوت، خود تو کہیں منہ کالا کر رہی ہوگی میرے چہنچہ کو ذلت سے دو چار کر کے در بدر کر دیا۔ میرا خان برسوں رہا ہے نہ مر رہا ہے۔“

تو بین کے احساس سے پھری بی بی جان اس پہ دھیوں کی مانند بل پڑی تھیں اور پھر باچا جان کی حالت پر اُدچی اُدچی آواز میں روتے ہوئے نڈھال ہو کے ایک جانب پڑ گئیں۔ پورا گھر حیرت کے عالم میں یہ منظر دیکھ رہا تھا، اس کے گھر کے درہ دیوار نے بھی شاید کسی خان زادی کی اتنی بلند آواز اور گونسنے پہلی بار سنے تھے، یوں لگتا تھا جیسے افراد کے ساتھ ساتھ دیواریں بھی کتے میں آگئی ہوں اور وہ... گھٹنوں کے بل زمین پہ بیٹھی، نیچے ہوئے بال، ادھڑی آستیں، سو بے رخساریوں اور ہونٹوں سے نکلنے خون سے بے خبر بی بی جان کا ایک ایک لفظ دہرا رہی تھی۔ پہلی بار اس نے ان کے منہ سے اپنی ماں کا ذکر سنا تھا

اور وہ بھی اس قدر تفصیل سے، اتنے بھیا تک انکشافات کے ساتھ۔ وہ بدن پہ گئی چونوں اور ملازموں تک کے سامنے ملنے والی اس ذلت سے بے پرواہ، بس یہ سوچ رہی تھی کہ چلو یہ راز تو کھلا میں۔ تہم نہیں ہوں، ورنہ زندگی کے کتنے برس اس الجھن کی کھوج میں بیت گئے کہ میری ماں زندہ ہے یا مر گئی یا اس کو طلاق مل گئی، میرا باپ اس دنیا میں کہیں ہے یا..... وہ دونوں اس دنیا کے کس نہ کسی کو نے میں موجود ہیں۔ اپنے کھوکھلے تعلق کی ایک بدنما یادگار سے بیکسر بے خبر، بالکل انجان۔

اور اسی رات اس کے نسل پڑھی چونوں پہ گرم کور کرتے ہوئے شاور منت کر رہی تھی۔ ”مقدس، تو انسان ہے یا پتھر، روتی کیوں نہیں، رو، خدا کے لیے رو لو تھوڑا سا۔“

”شانو، کیا میری ماں ہندو تھی..... اور کیا اس کی بہن سے میں کافر کی اولاد کہلاؤں گی؟“ وہ بولی بھی تو صرف یہ۔ ”تو کچھ پہلی بات تو یہ کہ تم ماسوں زریاب کی اولاد ہو اور مسلمان ہی کہلاؤ گی۔ اور یہ کہ میں نہیں مانتی تمہاری ممانندو تھیں۔ شاید وہ عیسائی ہوں یا پھر یہودی۔ اتنا تو میں جانتی ہوں کہ اہل کتاب سے مسلمان مرد کا نکاح جائز ہے۔ تو پھر ضرور مسلمان ہونے کے بعد ہی وہ اس گھر میں آئی ہوں گی، اگر بی بی جان کے کہنے کے مطابق وہ کافر تھیں ظاہر ہے کہ ہندو سے تو نکاح ہو ہی نہیں سکتا۔“

پھر یہ بھی تو ہو سکتا ہے بابا جان نے ان سے ایک..... میرا مطلب کیا ہے؟ اس نے کہنے کے ساتھ ہی خود اپنے لب دانٹوں سے کاٹ لیے۔

میں نے جاننے کی روایات کو جانتی ہوں اور یہ بھی کہ کس طرح ان کی سبب جانتے ہیں تمہاری ممانیک ڈیڑھ سال تک یہاں، اس گھر میں اس خلیق پہلی میں بہو کی حیثیت سے رکھی ہیں کیا ہمارے گھر کے مرد اتنی جرات کر سکتے ہیں کہ بغیر کسی نکاح کے، کسی عورت کو یہاں لا کے رکھ سکیں۔ ارے ہم لوگوں کے دادا، پردادا نے چھ چھ سات سات نکاح کر رکھے تھے لیکن ایسی حرکت... تو بہ تو بہ ایسا تو سوچو بھی مت۔“ وہ اس عمر میں بھی خاندانی روایات سے بخوبی آگاہ تھی۔

”تو اگر میری ممان مسلمان ہو چکی تھیں تو ان کے پچھلے حوالے کو کیوں یاد رکھا گیا ہے۔ کیوں انہیں ہندنی، کافر کی اولاد جیسے الفاظ سے یاد کیا جاتا ہے۔“ وہ احتجاجاً بلک اٹھی۔ ”اس لیے کیونکہ.....“ وہ اسے مطمئن کرنے کے لیے کچھ جواز سوچ رہی تھی کہ چچی جان گرم دودھ کا گلاس لے کے اندر داخل ہوئیں اور اس کی مشکل آسان کی۔

”اس لیے بیٹا، کیونکہ انہوں نے اپنا پچھلا حوالہ کسی کو بھولنے نہیں دیا۔ وہ اس خاندان میں رچ بس جاتیں یہاں کے قاعدے اصول اور روایات اپنا لیتیں تو آج شاید کوئی جان بھی نہ پاتا کہ خان زریاب خٹک کی بیوی کہاں سے آئی تھی۔ لیکن شاید وہ آزاد فضاؤں کی باسی چادر اور چادر یواری کی پابندی برداشت نہیں کر پائی۔ کون جانے اب تک وہ مسلمان رہی بھی ہے یا نہیں۔“

تمہارے پچھان دنوں ہارورڈ یونیورسٹی میں تھے انہیں تمہارے بابا جان نے تصاویر بھیجی تھیں، وہ بھی یہی کہتے ہیں کہ صحیح طرح نہیں جانتے وہ جرمن تھیں یا انگریز یا فرنج۔ اپنی شادی کے وقت جب یہاں آئے تو انہیں خبر ہوئی کہ بھائی کی گرجا آجڑے کئی ماہ ہو چکے ہیں۔ بی بی جان نے کبھی تفصیل کسی کو نہیں بتائی۔ لیکن مشہور یہی ہے کہ وہ تمہارے بابا کے ساتھ بھانہ سکیں، نہ ہی مشرقی طور اطوار کے بتائے پورے کر سکیں، شوہر کی غیر منہ جوریگی میں کسی اور کے ساتھ دوستی پیدا کر لی تھی انہوں نے، لالہ زریاب نے انہیں تو غیرت میں آ کے فوراً گھر سے نکال دیا لیکن خود بھی اجک ہنسائی کے خوف سے کسی اور پر ہوش نہیں تھا۔ خاندان کی ناموس پہ لگا یہ زخم ہمارے بزرگ بھلا نہیں پاتے۔“

”لیکن اس سارے قصے میں میرا تصور کہاں نکلتا ہے۔ میرے ساتھ سب کا رویہ تارل کیوں نہیں۔“ وہ سراپا سوال تھی۔

”میں پھر وہی بات کہوں گی کہ اس بار تمہارے بابا نے یہ سب کسی کو بھولنے نہ دیا۔ وہ خود اگر اس سانچے کو فراموش کر دیتے، تمہارے ساتھ ساتھ سن جوتے، اپنا گھر بسا لیتے تو لوگ بھی کب کے بھول بھال چکے ہوتے۔ ان کی خود ساختہ جلا وطنی اس زخم پہ کھرنہ نہیں آنے دیتی۔ ہر زخم کو مرہم چاہیے۔ جن زخموں کا منہ کھلا رہ جائے وہ ٹیس تو دیتے ہیں۔ تمہارا وجود باچا جان اور بڑے لالہ کو لالہ زریاب کی یاد دلاتا ہے۔ تمہارا نکلا ہوا کھانا انہیں یاد دلاتا ہے۔ حیرت کی بات ہے دونوں بھائیوں کے سنا کوڑ کوڑے سنا کوڑے بھی نہیں کی۔ مگر انہیں یقین ہے وہ ضرور ایک دن لوٹیں گے، چودہ سال سے اوپر ہو رہے ہیں مجھے اس گھر میں آئے، میں نے آن تک ان کا کوئی خط، کوئی پیغام، کوئی اطلاع آتے نہیں دیکھی۔ ایک بار تمہارے چچا سے کہا تھا کہ بڑے لالہ اتنے اثر و رسوخ والے ہیں وہ کیوں نہیں کوشش کرتے بھائی کو کھوجنے کی، تو کہنے لگے اس کی ضرورت نہیں، وہ لوٹ آئیں گے بلکہ لوٹنے ہی والے ہیں۔ اللہ کرے ان کا یقین سچ ہی ثابت ہو، اگر ایسا ہو جائے تو تمہارا امتحان بھی ختم ہو جائے گا۔ کون جانے کہ خون کی کشش انہیں کب کھینچ کے نلے آئے۔“ انہوں نے بات مکمل کرتے ہوئے دودھ کا گلاس اس کے لبوں سے لگایا۔

”جی نہیں کرتا چچی جان۔“ اس نے ہاتھ سے پرے کرتے ہوئے ٹوٹے لہجے میں کہا۔

”یہ پکڑو شانو، اسے پلاؤ اور یہ سمجھاؤ کہ جن کے لیے اس کا وجود نہ ہونے کے برابر ہے اور جو اسے دنیا میں لانے کی وجہ بننے کے باوجود اسے بھلائے بیٹھے ہیں ان کی خاطر کیوں خود کو ہٹان کر رہی ہے۔ ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے، میں اتنی تھی تو گھر میں کیا ہوا، کیسے ہوا کی خبر ہی نہ ہوتی تھی، اسے اس کی کم عمری کے باوجود میں نے وہ تمام تلخ باتیں اور انکشافات بتادئے، جتنے کہ میں جانتی تھی صرف اس لیے کہ اس کے اندر کے کچھ سوال تو خاموش ہوں۔ جو ہے اسے بدلانا نہیں جاسکتا۔ اپنی زندگی کی قدر کرو۔ اسے جیو اپنی پہچان خود بناؤ۔“

اسے لاہور بھیج دیا گیا۔ کینیڈا کالج میں فرسٹ ایئر کی لیسٹوڈنٹ کی حیثیت سے جب وہ پہلی بار داخل ہوئی تو اتنی بڑا اعتماد ہرگز نہیں تھی جتنے گزرے دنوں نے اسے بنا دیا تھا۔ یہاں کوئی اس پہ، اس کی ذات پہ کچھ اچھا کرنے والا نہیں تھا۔ یکسوئی اور ذہنی سکون نے اسے اس کی جانب راغب کر دیا، لہذا تمہاری غلطی ملاحتیں کچھل کے نکھر کے سامنے آ گئیں۔ اب کالج کی ہونہار طالبہ تھی۔ ایف ایس سی میں ٹاپ کر لینے کے بعد اس نے میڈیکل لائن کو چننا اور کنگ ایڈورڈ میں چلی آئی۔

یہ بڑھائی سال اس نے محض اپنی ذات کی ہمراہی میں گزارے۔ نہ خود کبھی ماں، نہ باپ کے بارے میں سوچنے کی ضرورت محسوس کی اور نہ ہی کسی کو اپنے اتنے قریب آنے دیا۔ اس نے ہونے والے درد جگاتا۔

یہ بڑھائی سال اس نے محض اپنی ذات کی ہمراہی میں گزارے۔ نہ خود کبھی ماں، نہ باپ کے بارے میں سوچنے کی ضرورت محسوس کی اور نہ ہی کسی کو اپنے اتنے قریب آنے دیا۔ اس نے ہونے والے درد جگاتا۔

یہ بڑھائی سال اس نے محض اپنی ذات کی ہمراہی میں گزارے۔ نہ خود کبھی ماں، نہ باپ کے بارے میں سوچنے کی ضرورت محسوس کی اور نہ ہی کسی کو اپنے اتنے قریب آنے دیا۔ اس نے ہونے والے درد جگاتا۔

”بابا جانی پلیز بی بی جان کو سمجھائیے ناں، یہاں پورے سرحد میں کوئی آرٹ اسکول نہیں ہے۔ میں فائن آرٹس میں ماسٹرز کرنا چاہتی ہوں۔ اگر مجھے این سی اے میں ایڈمیشن نہ دلایا گیا تو مزید آگے ہرگز نہیں پڑھوں گی۔“

یہ دھمکی بی بی جان کو بھی کچھ سوچنے پہ مجبور کر گئی۔ اس کی بات بہت پہلے سے
افریاب خان کے بڑے بیٹے گل ریز خان خٹک سے طے تھی جو لندن میں اعلیٰ تعلیم کی
منازل طے کر رہا تھا۔ جب کہ شانو کو سرے سے پڑھائی کی طرف دلچسپی ہی نہ تھی۔ وہ
جانتی تھیں زمانہ بدل رہا ہے، بچے اپنے بزرگوں کے فیصلوں میں نقص نکالنے کو تیار رہتے
ہیں، کہیں تعلیم کی کمی اس رشتے کے ختم ہونے کا جواز نہ بن جائے۔ شاید اپنی مرضی کی تعلیم
اسے پڑھنے لکھنے کی جانب راغب کر ہی دے۔

”چلو کم از کم کوئی تو وارث ٹھہرے گا تمہارے ماموں کے رنگوں سے کھیلنے کے شوق
کا۔“ وہ مسکرا کے بولے۔

”ماموں؟ کون سے ماموں۔ چھوٹے ماموں تو ہرگز اس طرف مائل نہیں ہو سکتے تھے
کیا بڑے ماموں مصوری کا شوق رکھتے تھے؟“
”نہیں وہ تمہارے مغلے ماموں، خان زریاب خٹک، وہ تو اتنا تھا تو تمہاری طرف سے
رنگوں کا، حسن کا۔“ وہ نجانے کیوں اداس ہو گئے آخر میں سر لڑکھائی کی ایک حرکت کر رہا تھا۔
شناور ان کے بارے میں اور بھی کچھ پوچھنا چاہتی تھی لیکن بی بی جان کے سبب چہرے اور
بابا کے شکستہ تیور دیکھ کر الجھی گئی۔ ماحول پہ ایک بو جھل پن سا طاری تھا۔ مقدس غرصے بعد
اُبھرتے تجسس کے احساس سے گھبرا گئی۔ وہ پھر سے اس کیا، کیوں، کب اور کیسے کے جال
میں پھنستا نہیں چاہتی تھی۔ بہت مشکل سے اپنے منتشر ذہن کو ایک طرف مائل کیا
تھا اس نے کچھ بن جانے کا، اپنی شناخت خود بنانے کا۔

شناور کے لاہور آ جانے سے بھی اس کی یکسوئی میں خلل پڑا۔ وہ اکثر انجانے میں
اس کے خوابیدہ تجسس کو جگا دیتی۔ ایک دن تو بھند ہو گئی۔
”تم چلو تو ایک بار میرے ہاسٹل، دیکھو تو کسی میں غلط نہیں رہی۔
”میں نے کب کہا تم غلط کہہ رہی ہو۔ ہو جاتی ہے اکثر ایسی مشابہت، لیکن میں کیا
کروں گی اس عورت سے لڑ کے۔“

”تسم سے میں تو اسے دیکھ کے حیران ہی رہ گئی، ہو ہو تمہاری آنکھیں، یہی تاک،
چہرے کا نچلا حصہ جلا ہوا ہے اس کا، دونہ کیا پتا تم دونوں ہم شکل ہی کہلاتیں۔ بلکہ سچ پوچھو تو
ایک بار میرے ذہن میں یہ خیال بھی آیا کہ نہیں یہ تمہاری ماسی نہ ہوں۔ لیکن خیر اس کا تو
سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ پٹھان ہی ہے بالکل دیہاتی تسم کی، کسی پہاڑی علاقے کی لگتی ہے۔
ماتھے اور رخسار پہ تل گوڑے ہوئے ہیں، یہ لمبا گھونگھٹ نکالتی ہے۔ لیکن کبھی کبھی بغیر کسی تعلق
اور رشتے کے بھی کس درجہ مشابہت پائی جاتی ہے دو انسانوں میں تم ایک بار اگر دیکھ

”لیکن میں کیوں دیکھوں۔ میں نے اپنی آنکھیں ہزار بار دیکھی ہیں، یہ چہرہ دن
میں کئی بار آئینے میں دیکھتی ہوں، پھر ایسی ہی آنکھیں، ایسی ہی تاک دیکھنے کے لیے
فضول وقت کیوں ضائع کروں۔ خدا کے لیے شانو اب بڑی ہو جاؤ، ایسی ایسی باتیں کرتی
ہو کہ خدا کی پناہ، ایک پہاڑی دیہاتی عورت سے خواستواہ مجھے جوڑنے کی کوشش کر رہی ہو
محض اس بناء پہ کہ ہماری آنکھوں کا رنگ ایک ہے۔“ وہ بیزاری سے بولی۔

”مجھے تو حیرت اس بات پہ ہوئی کہ پورے خاندان میں کسی سے تمہارا۔“ نقشہ نہیں
ملتا، جب کہ ایک بالکل انجان عورت، ہمارے ہاسٹل کے کچن میں کام کرنے والی.....“
”یلیز شناور جسٹ اسٹاپ اٹ۔ ایک بات سیکے پیچھے مت پڑ جا یا ارد۔“ اس نے

باقاعدہ ہاتھ جوڑے تو وہ جب ہوئی۔
بی بی جان سے بڑی ہی بحث کے بعد میں نے زریاب ماموں کے اسٹوڈیو کی
چابی حاصل کی ہے۔ چلاؤ پھوپھتے میں۔
”کیا؟ بارا کے اسٹوڈیو کی چابی؟ جان ڈان کے دونوں کمرے لاکر رہتی ہیں۔
ذہن کو جانے کی اجازت نہیں، پھر نہیں کہوں، ہمارے ذہن ہی ہیں۔“ وہ تیرت، یہ بار۔
”سب سے مشکل سے سمجھا پائی انہیں، کئی امرتھن کے لیے مجھے بالکل غریب اور
مستحق بنا دیا۔ چاہے یہ ہمارے لیے ہوں۔ ہاسٹل جہاں کی کچھ بیننگ۔ وہ ڈیڑھ گھنٹہ
ہو گیا کہ کچھ انہیں شین لڑے۔“
”وہ سیزر ہالے کے نیم دراز ہو گئی۔“ مینن بھتی

اپنے کمرے میں کیا نہیں آ سکتیں میرے ساتھ؟“
جان، میں پٹھانوں کے چند دن یہاں گزارنے آئی ہوں۔ مجھے سکون سے
رہنے دو۔ میں نہیں چاہتی میرے کسی بھی عمل سے بی بی جان کو میرا سال میں چند دن یہاں
گزارنا بھی دو بھر گئے، تر جاتی ہو میری لاکھ احتیاط کے باوجود کبھی کبھی میری کوئی بات ان کا
پارہ چڑھاتی ہے۔ اس کمرے میں جانے کی اجازت صرف تمہیں ملی ہے
”کیوں تمہارے پاس کیا یہ جواز کم ہے کہ وہ تمہارے بابا جان کا کمرہ ہے۔ عجیب ہے
حس لڑکی، دو تم۔ وہ میرے ماموں ہیں جنہیں میں نے کبھی دیکھا تک نہیں، لیکن آتا پہلی بار
ان کے کمرے میں جاتے ہوئے میں اس قدر ایکساٹڈ ہوں۔ تم ان کی بیٹی ہو کیا تمہارا دل
نہیں چاہتا تم اس کمرے میں جاؤ جہاں انہوں نے پہر بتائے ہوں گے، ان چیزوں کو چھوؤ جو
کبھی ان کے استعمال میں رہیں۔ ان کی تمہیقات دیکھو۔“ اس نے اُسکیا تو مقدس ادا سی

URDU PHOTO

سے مسکرا دی۔

”میں بھی ان ہی کی ایک چیز ہوں جسے کبھی نہ کبھی تو انہوں نے چھوا ہی ہوگا۔ میں بھی ان ہی کی ایک تخلیق ہوں جسے دیکھنے کو ان کا کبھی ہی نہ جاہا۔“

اور واقعی ایک روز پہلے تک اس کے دل میں کوئی خواہش نہ تھی اپنی ہستی کے سربستہ رازوں سے واقف ہونے کی۔ لیکن باچا جان کی وصیت نے تو گویا ایک دھماکا کر دیا۔ ہر ایک انگشت بدنداں تھا۔ ہر فرد خصوصاً تایا جان اور چچا جان اسے قہر آلود نگاہوں سے گھورتے گزر رہے تھے۔ چچا جان نے اسے بی بی جان کے قبر سے بچانے کے لیے کمرے میں بند کر دیا تھا۔ لیکن بی بی جان کی غضب ناک آوازیں اور تائی جان کے بلند گونسنے اسے دیواریں چیر کے دھمکا رہے تھے۔ ایک عرصہ دو اس نے اپنی ذات اس گھر کے کینوں سے اس قدر الگ تھلگ کر لی تھی کہ ان کے کسی قسم کے رویے کی وجہ سے اس تک نہ پہنچ پاتی تھی۔

آج برسوں بعد وہ پھر زیرِ عتاب تھی اور اس بار بڑی بڑی کھانسی کیونکہ پہلے پہلے اس کا ہدف اس کی ماں کا مشتبہ حوالہ تھا۔ خاندان کو اس کے باپ کی طرف سے نئے نئے ٹھکانے کا غم و غصہ تھا اور اب کی بار وہ خود انہیں مشتعل کرنے کی کوششیں کر رہی تھی۔ اس کی سر اس کی بے مول و بے وقعت ہستی کی خاطر باچا جان نے صدیوں پہلی روایت توڑ ڈالی تھی۔ معتبر بیٹوں کے ہوتے ہوئے اسے خاندانی ورثہ کا امین قرار دیا تھا۔ وہ خود نہیں سمجھ پارہی تھی کہ ان کے اس فیصلے کے پیچھے کیا مقصد رہا ہوگا۔ ترس، ہمدردی، ازالہ یا آخری وقت میں کی گئی کوئی نیکی سمجھ کے وہ اپنی اس نظر انداز کی جانے والی پوتی کو خاندان بھر میں لانا چاہ رہی تھی۔

”لیکن ان کے اس نمل میں میری کون سی بھلائی ہو سکتی ہے۔“ وہ سوچتی رہی۔

”یہ لوگ، میرے سر پرست جو تمام تر کدورت کے باوجود میرے نگران کہلاتے ہیں، میری تعلیم، رہائش اور تمام اخراجات برداشت کرتے ہیں، ان سے لوگوں کو میری شکر ادا کر دینے میں میری کیا بھلائی ہو سکتی ہے۔ کیا تایا جان کبھی میرے پاس آئے ہیں؟“

کیا ان کی اولاد بھول پائے گی اس بات کو کہ میں ان کا حق انجامانے میں ہی مگر ہزپ کر گئی۔ کیا بی بی جان کو گوارا ہوگا وہ بالشت بھر کی لڑکی، جسے مخاطب کرنا بھی وہ اپنی توہین سمجھتی ہیں، ان کے گھراٹا اونچا زتبہ حاصل کر بیٹھے گی۔

باچا جان تو قلم کر رہے ہیں میرے ساتھ میں پہلے ہی بے سہارا ہوں، وہ مجھے دشمنوں کے نرنے میں دیے جا رہے ہیں۔ مجھے ان سے بات کرنا ہوگی۔ انہیں اپنا فیصلہ واپس لینے پہ مجبور کرنا ہوگا۔ اگر انہوں نے میری دلجوئی کی خاطر یہ ثابت کرنے کے لیے کہ وہ اپنے نخلے بیٹے کی غیر موجودگی میں بھی اسے کتنا اہم جانتے ہیں، یہ اقدام کیا ہے تو میں یہ تسلیم کر لوں گی

کہ ہاں باچا جان، آپ نے انصاف سے کام لیا۔ آج بیس سال بعد میں آپ کو نظر آئی تھی۔

لیکن بس..... بس اتنا ہی... اتنا ہی کافی ہے کہ... میں آپ کی نظر میں آ گئی۔

بس..... مگر مجھے دوسروں کی نگاہوں میں تو غائب مت ٹھہرائیے میں تجھسی ہوئی ہوں، تپتے مزا جوں کی مار سے، انجامانے جرموں کی سزا بھگت رہی ہوں، بیس برس سے۔ اب تک مہما کی بے وفائی اور بابا کی بے انتہائی کی سزائیں جھیلی آ رہی ہوں۔ اب آپ کی ہمدردی کا خمیازہ اٹھانا پڑے گا۔ آپ کی یہ مہربانی بہت پہنچی پڑے گی مجھے باچا جان، جو خاندان میری ماں کا ایک غیر قوم سے، دنا گناہ فظیم قرار دے کے مجھے اپنی مکمل شناخت دینے سے انکاری ہو جب کہ میری رگوں میں بھی وہی خون دوڑ رہا ہے جو ان کے لیے باعثِ افتخار ہے چاہے مجھے جنم سے ایک ایسی عورت نے ہی کیوں نہ دیا ہو جو ان کے لیے باعثِ شرم ہے۔

یہ لوگ مجھے اپنی اولاد کے براجر کھڑا کرنا پسند نہیں کرتے کیونکہ وہ ماں اور باپ دونوں کی طرف سے اہل نسل ہیں، جب کہ میرے خون میں ملاوٹ ہے ان کی نظر میں، تو پھر اپنی اولاد سے اوپر کیسے دیکھ سکیں گے مجھے، مجھے کہیں جائے پناہ نہیں ملے گی۔

اس نے فیصلہ کر لیا لیکن اس فیصلے پر عمل کرنے کی ہمت پیدا کرنے میں وہ قطعی ناکام ثابت ہوئی۔ اس کا اندازہ اسے اسی رات ہو گیا جب باچا جان کے کمرے میں اسے کاغذات پر دستخط کرانے کے لیے طلب کیا گیا۔

اوپر چھتوں والے بڑے سے کمرے میں پہلا قدم دھرتے ہی اس کی ریڑھ کی ہڈی ایک سیدھی ڈرگنی اور یہ سرد لہر اس قدر خالم تھی کہ اس کا لمس پاتے ہی اس کی ریڑھ کی ہڈی لٹکتی تھی۔ وہ کاد کا بوجہ اٹھانے سے انکار کر دیا۔

پہلی بار اس نے اپنے کمرے میں بیٹھی کبھی دشوار سانسوں کے ساتھ اس کا منتظر تھا۔ دیکھ کر اسے اس کا بدمعنی ہوتی لڑکی کو دیکھ رہے تھے۔ چچا جان نے جیسے شکار کی پالکی میں لپیٹ کر لائی تھی ان کی نگاہیں مقدس کا نشانہ لے رہی تھیں اور تایا جان اسے راستے سے بنانے کے لیے شاید کوئی سیاق چال مٹنے کا سوچ رہے تھے اور... اور... بی بی جان ان پر ایک ڈری ڈری سی نظر ڈالنے کے بعد تو اس کی ہمت نے دل کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ کس حوصلے اور جرات سے اس نے یہ ہمت مجتمع کی اور دل کے ہاتھ میں اس کا ہاتھ دیا تھا، لیکن اب وہی ہمت ہاتھ چھڑا کے دل سے ایک ایک سیرمی پھسلتی جا رہی تھی۔

اس کے گھٹنے بے جان ہو کے مڑ گئے، وہ فرش پہ گرنے ہی والی تھی کہ نرس نے آگے بڑھ کے اسے سنبھالا، باچا جان کے بستر کی تریبی کرسی پہ بٹھاتے ہوئے ایک ہمدردی بھری

نظر اس کے ٹھنڈے ٹھار نیلے ہوتے چہرے پہ ذالی اور پھر تاسف سے سر ہلاتی باہر چلی گئی۔ وہ انجان، بے گانی ملازمہ شاید اس سارے قصے سے اس کی نسبت زیادہ واقف تھی۔ اسے اپنی کم آگاہی پہ اور بے بسی محسوس ہونے لگی۔

”لو بیٹا، یہاں سائن کر دو۔“ وکیل صاحب نے قلم اور کاغذ اس کے آگے کیا۔
 ”یہ تحریری ثبوت ہوگا اس بات کا کہ ایک عاقل و بالغ آزاد فرد کی حیثیت سے تمہیں اپنے دادا کی اس وصیت پہ کوئی اعتراض نہیں جس کی زور سے تمہیں اس خاندان میں صدیوں سے چلے آ رہے قیمتی نوادرات، زیورات اور اپنے آباؤ اجداد کی دیگر نشانیوں کا وارث ٹھہرایا گیا ہے۔ تم ان کی حفاظت خلوص نیت سے کرنے کی پابند ہوگی، نیز تمہیں اس کی خرید و فروخت کرنے یا کسی غیر خاندان کے فرد کو انہیں تحفتاً یا قیمتاً دینے کی ممانعت ہے۔“

”ایک منٹ وکیل صاحب“ تایا جان بے چینی سے اپنے کھڑے ہوئے۔
 ”باچا جان ایک بار اور سوچ لیجئے، آپ جذباتی ہو گئے ہیں۔ فیصلہ کرنا ہے لیکن باچا جان نے ان سنی کرتے ہوئے اپنا نیلی اٹھارہ سوئی، اونچی اور بال ہاتھ آگے بڑھا کے وکیل کو کارروائی جاری رکھنے کا حکم دیا۔ اس کا گود میں دھرا کھپکا ہاتھ جب آگے نہ بڑھا تو وکیل صاحب نے کاغذ اس کے سامنے دھرا اور قلم مزید آگے کر کے اسے تھمانے کی کوشش کی۔ قلم اس کی انگلیوں سے مس ہوا تو ان کی کھپکا ہٹ بجی منبند ہو گئی اور اس کا بھاری ہوتا سر سائیں سائیں کرتا ہوا بے جان سا ہو کے اس کی گود میں آگیا۔
 ”اوخدا، یہ بے ہوش ہو چکی ہے۔ نرس، نرس۔“ وکیل صاحب نے ایمر جنسی نیل دینے کے ساتھ ساتھ آدازیں بھی دیں۔

باچا جان سر اٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے اسے دیکھنے لگے۔ نرس نے آگے بڑھ کے بلڈ پریشر چیک کیا۔
 ”او، بی پی بہت لو ہے۔ سر ہائی بلڈ پریشر کے مریض ہیں میرے پاس اس وقت لو بی پی کی کوئی میڈیسن نہیں میں ٹیبلٹ لکھ دیتی ہوں آپ منگوا دیجئے“ ان کے ہوش میں آنے پہ دے دوں گی۔“ وہ ہاتھ ہم سہلاتے ہوئے بولی۔
 ”یہاں..... اے..... ادھر لاؤ“ باچا جان ہت کر کے بولے۔ اس نے فوراً ہی اسے کرسی سے بیڈ پہ ان کے پہلو میں منتقل کر دیا۔
 ”سر میں ان کے لیے جوس بنواتی ہوں۔“ وہ باہر نکل گئی تو وکیل صاحب بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔
 ”خان صاحب مجھے اجازت دیجئے۔ میرا خیال ہے اس وقت یہ کام نہیں ہو سکتا۔ آپ

پھر مجھے طلب کر لیجئے گا خدا حافظ۔

☆☆☆

نیم بے ہوشی کے عالم میں اس نے خود کو چند قد آور گہرے سایوں کے زرخے میں پایا۔ وہ اپنی برف میں لگی انگلیاں ترخ ترخ کی آواز کے ساتھ کھولتے ہوئے قدموں میں پڑا قلم اٹھاتا چاہتی ہے، لیکن ہر بار اس کا ہاتھ قلم کو چھونے سے پہلے ہی کوئی ٹھوکر مار کے اسے چند قدم اور دور کر دیتا ہے۔ اس نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولنے چاہے تو بی بی جان نے اپنا مضبوط ہاتھ اس کے منہ پہ جما دیا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے بے بسی کے ساتھ ہاتھ پیڑ ہلاتی رہی اور تایا جان، چچا جان اور بی بی جان اس کے سامنے ہی اس کے ایک ہم شکل وجود کے پرچے اڑا رہے تھے۔ یہ وجود جو خود اس کا تھا۔

”مگر میں..... میں تو..... بی بی جان نے میرے ٹیوں پہ پتھلی جمار کھی ہے اور..... میں خود ہی اپنے آپ کو کیسے بکھرتے دیکھ رہی ہوں۔“
 یہ خیال اس کے لیے ہوشی میں ڈوبے وجود کو ہاتھ تھام کے ہوش کی سرحد پہ کھینچ لایا اور اس کے کانوں میں آئی آدازیں اسے یاد دلاتے لگیں کہ اس وقت وہ کہاں ہے۔

”آپ میرے ساتھ زیادتی کر رہے ہیں باچا جان۔“
 تایا جان کی آواز میں برہمی تھی، غصہ تھا اور جھنجھلاہٹ تھی۔ وہ اتنا اثر درسون، رعب و دبدبہ کہتے ہوئے بھی اس نجیف وجود کے سامنے بے بس تھے۔ ان کا ادب، ان کا لحاظ بہت کچھ سنبھل کر رہا تھا۔

خاندان سرحد کے چند ممتاز اور قابل احترام خاندانوں میں شمار ہوتا ہے اور ایک زمانہ تک سرحد کے بڑے بیٹے کی حیثیت سے جانتا ہے، یہ حقیقت بھی سب پہ عیاں ہے کہ ہر دور میں ہاں باہر اپنے بڑے بیٹے کو خاندانی پشت در پشت چلے آ رہے قیمتی ورثے کی حراست کی جاتی ہے۔ اس کا اعلان ہے۔ جب کہ آپ کا یہ قدم میری حیثیت مشکوک کر دیتے گا۔“
 ”تمہاری..... حیثیت پر..... کک..... کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“ باچا جان نے اطمینان دلانا چاہا۔

”کیسے نہیں پڑے گا۔ بلکہ میری سیاسی پوزیشن بھی خطرے میں پڑ جائے گی، آپ کا حوالہ میرے لیے محترم سہی مگر میں نے خود اپنی شناخت ایک لمبی جدوجہد کے بعد حاصل کی ہے۔ ملک کے سیاسی اُفق پہ اس وقت میرا نام ایک بے داغ شخصیت رکھنے والے سیاست دان کا ہے۔ لیکن اب لوگ میرے بارے میں چہ میگوئیاں کریں گے۔ جسے اس کے خاندان والے، اس کا باپ قابل اعتبار نہ جانیں، عوام کیسے اس کی ذات پہ بھروسہ کر لے گی۔ اگر آپ

نے اپنا فیصلہ نہ بدخواہی میں میرا جیتنا ناممکن ہے۔ آپ جانتے ہیں ہماری پختوں
برادری کی ذہنیت کو وہ لوگ خاندانی ناموس کو اول جانتے ہیں۔ برائے مہربانی اپنے فیصلے میں
ترمیم کیجئے۔“ وہ منت پہ اتر آئے۔

”میرا فیصلہ..... اکل..... ہے۔“

”تو پھر ٹھیک ہے۔“ وہ جیبوں میں ہاتھ ٹھونکتے کھڑے ہو گئے۔

”میں اپنا حق بھولنا بخوبی جانتا ہوں۔ اپنی برسوں کی محنت سے حاصل کیا گیا یہ مقام
بر حال میں بچاؤں کا۔ اپنے بل بوتے پہ بنائے اپنے سیاسی کیریئر کو میں آپ کی بلاوجہ کی ضد
پہ ہرگز قربان نہیں کروں گا۔“ وہ فیصلہ کن لہجے میں بولے تو اب تک خاموش بیٹھے چچا جان اور
بی بی جان بھی چونک اٹھیں آخر دراب چچا نے بولنے میں پہل کی۔

”وہ ہمارے پاس زریاب لالہ کی امانت ہے بڑے لالہ۔ یہ بات آپ کو یاد رکھنی

چاہیے۔“

جانتا ہوں، اسی لیے تو..... اس لیے تو..... وہ مٹھیاں پہنچنے

”ورنہ اس کی صورت مجھے اس نامراد، بد بختی کی یاد دلاتی ہے۔“

نے ہاتھ تمام رکھا ہے۔ اس نے جاتے ہوئے منت کی کٹی پھری کہ یہ لڑکی اس خاندان میں ہی

رہنی چاہیے۔ اس کی ماں کا سایہ بھی نہ پڑنے پائے اس پہ۔“

”اور ہمیں یہ عہد نبھانا ہی ہے۔“ دراب خٹک نے پُرسوج انداز میں کہا۔

”خاص طور پر اس لیے کہ اب زریاب لالہ کے آنے میں کتنی ہے۔ میرا تو خیال

ہے باچا جان کہ آپ کچھ عرصہ مزید انتظار کر لیں۔ لالہ کے آنے کے بعد میں کوئی فیصلہ

گا۔“ ان کی باہونق پیش گوئی سن کر مقدس پوری طرح حواسوں میں آ گئی، اب اس نے اپنا

آنکھیں موندے رکھنا دشوار لگنے لگا۔

”کہاں ہیں نیرے بابا؟“

”کب آنے والے ہیں وہ؟“

”کیوں اتنے عرصے سے غائب ہیں وہ؟“

ان سب سوالوں کے جواب وہ کمرے میں موجود نمبوس کے چہروں سے حرج کر پڑھنا

چاہتی تھی۔

”اور کیا پتا وہ بھی اس بد بخت کی صورت دیکھنا چاہے گا؟ نہیں۔“ بی بی جان کے سناک

تبرے نے اسے آنکھیں کھولنے سے پھر روک دیا۔

”اسی لیے اسی لیے تو..... میں یہ یہ کر رہا ہوں اتنے سالوں سے وہ ہم سب

کی بچہ کم از کم اب تو..... اسے اولاد کا سکھ، اس کے دل کو صاف کرنا ہے۔“ باچا جان کی
دشوار کھڑی سانسوں میں مدھم فقروں سے چند الفاظ بے ربط سے انداز میں اس کے کانوں

میں پڑے۔

بے وفائی کے داغ یونہی نہیں صاف ہو جاتے دلوں سے۔“ دراب چچا نے

بولے۔ ”نجانے کیا ذہن سوار ہو گئی ہے آپ کو باچا جان، بھلا جانیداد میں اس لڑکی کو حصہ دار

بنانے سے ان ساری باتوں کا کیا اعلق ہے۔ کیا مل جائے گا اس سارے بکھیرے سے۔“

”تانی۔“ باچا جان کے لبوں سے کراہ کی صورت ایک لفظ نکل کر فضا میں ٹھہر گیا۔ لہجہ

بھر کو سب ساکت ہو گئے۔ تانیا جان اور چچا جان کی خاموشی میں استعجاب تھا اور بی بی جان کے

سکوت میں کسی انہونی کا خدشہ۔

”کتنی تانی کیا ظلم تو کئے ہیں جیسا اس پہ۔“ کچھ دیر بعد تانیا جان گویا ہوئے۔

”کیا اس کی تعلیم یا تربیت میں کسی بات کی کمی رہ گئی ہے۔ رہی بات لاڈ پیار جتانے کی

وجہ دلوں سے معاملے ہیں اور خٹک خاندان میں کوئی منافق نہیں۔ جو وجود آپ کے کھر بند

کھر چتا ہے اسے آپ سر آنکھوں پہ تو نہیں بٹھا سکتے۔ یہی کیا کم ہے کہ وہ اس عورت کی بیٹی

ہونے کے باوجود اس سچت تلے رہتی آئی ہے۔ پھر بھی اگر آپ سمجھتے ہیں کہ

یہاں اس کے ساتھ کوئی نا انصافی ہوئی ہے اور اس کا احساس آپ کے دل پر بوجھ بڑھا رہا

ہے تو اسے تانیا جان کا کوئی اور طریقہ بھی تو ممکن ہوگا۔“ تانیا جان ہر صورت وہ فیصلہ بدلنا چاہتے

تھے۔ کمرے کے طول و عرض میں ان کے بے تابانہ گھومتے قدموں کی جھمک سے بخوبی سنانی

ہوتی تھی۔

”لیکن افراسیاب کا ایک ہی بیٹا ہے اور سب جانتے ہیں وہ شناور سے منسوب ہے۔“

بی بی جان نے خٹکی بھرے انداز میں جتایا۔ ”اور دراب کے دونوں لڑکے۔“ انہوں نے کچھ

کہنے سے تانیا جان کی طرف دیکھا وہ محض کندھے اچکا کر رہ گئے۔ ان کا تعلق اپنی اولاد سے

ایسے ہی تھا۔

”نہیں بی بی جان وہ دونوں ہی اس سے پانچ چھ سال چھوٹے ہیں۔ کیوں باچا

جان۔“ تانیا جان نے کہا۔

”ہاں اتنا فرق..... یہ تو ظلم ہوگا اس پہ۔ ایک اور ظلم۔“

”کیوں خان! بی بی جان نے دکھ بھرے انداز میں پوچھا۔ ”میری بی بی کے لیے کسی کو بارہ سال کا فرق نظر نہ آیا۔ اس بد نصیب پہ کس نے یہ ظلم توڑا۔ کبھی اپنی اکلوتی بی بی کے ساتھ کی گئی تا انصافی کی تلافی کا خیال آیا آپ کو۔“ تاجا جان کے جمریوں بھرے چہرے پہ وہ آنسو پھسل گئے۔ ان کی سانہوں کا زیرہ بھر پھر پریشان ہونے لگا۔

”خدا کے لیے بی بی جان۔ اس قسم کے مسئلے مت چھیڑیں۔ ان کی حالت دیکھیں آپ۔“ کب سے ٹانگ پہ ٹانگ چڑھا کے بیٹھے دراب خنک نے لپک کے باپ کو سنبالا اور ان کا سینہ ہلانے لگا۔ افراسیاب خنک نے نرس کو کال دے دی۔

”بی بی جان، خود کو سنبالیں، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ باچا جان بھی ٹھیک کہتے ہیں اب وہ زمانہ نہیں رہا۔ بہر حال دراب کی بات میں بھی وزن ہے زریاب کے آنے میں چند ماہ ہی رہ گئے ہیں۔ تب تک کے لیے اس مسئلے کو آٹھ دس روز دیکھیں۔ میں یہ سوچتا ہوں کہ وہ کب سے گا، مجھے اور دراب کو اعتراض نہیں ہوگا۔ نہ تو اس خاندان میں وہ بیویاں رکھنے کی سبب داتا کا اور بی بی عمریوں کا فرق کوئی انہونی چیز ہے، یہاں سب بیٹے ہی تھے۔“ دراب خنک نے بی بی جان کو دیکھا۔

”باچا جان کو آکسیجن لگانے کے بعد نرس اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

”انہو، بے بی، کیا تم سن رہی ہو؟“ بیابا اس کے حال تھپتھانے کے ساتھ ساتھ وہ اس پہ پانی کے چھینٹے بھی دیتی گئی۔ اب مقدس کے لیے بے سدھ بننے کی ایکٹنگ کر رہا دشوار ہو گیا۔ وہ ہلکا سا مسائی۔ اسے اُمتداد دیکر وہ تینوں کیوں نہ تھے جیسے اب تک اس کی موجودگی سے لالٹم ہوں۔ کمرے میں ایک در پھر سکون چھا گیا۔ وہ نرس کا سہارا لیے دھیرے دھیرے چلتی کمرے سے نکلی گئی۔ اس نے نجانے کون سی ٹیٹ کھائی تھی کہ سر بھاری ہو چکا تھا۔ جارہا تھا اور آنکھیں نیند سے بوجھیں۔

URDU PHOTO

☆ ☆ ☆

”ہیلو سوین کزن، مکمل ہو گیا آج تو، اتنی لمبی نیند؟“ آنکھ کھولتے ہی خود پہ شاندار کھینچے پایا۔ وہ حیرانہ نچا کر کے ذرا سا اٹھ بیٹھی۔ دھن! ابھی بھی نیم خوابیدہ تھا لیکن پورا وجود سبک سا ہو رہا تھا۔ اس نے ہلکے پھلکے ہونے کے اس احساس کو سرنیک کر پوری طرح محسوس کرنے کی کوشش کی لیکن دوبارہ سے آنکھ بند کرتے ہی باچا جان کے کمرے میں ہونے والی کارروائی کی باز نشست سائی دینے لگی وہ ایک جھٹکے سے بیٹھ گئی۔

”کیا ہوا؟ ابھی طبیعت نہیں سنبھلی کیا؟“ شادور تشویش سے بولی۔

”نہیں اب ٹھیک ہوں میں، پہلے سے بہت بہتر۔“

مقدس نے خنک لبوں پہ زبان پھیری۔ ”شانو... تمہارے پاس بابا جان کی اسٹوڈیو کی چابی ہے ناں؟“

”ہاں... ابھی تک میرے ہی پاس ہے، کچھ فوٹو گرافس ہیں، ماموں جان کے کھنچے ہوئے جن سے میں لینڈ اسکیپ کے آئیڈیا لینا چاہتی ہوں، لیکن تم کیوں پوچھ رہی ہو۔“ وہ حیران تھی کل تک تو وہ کوئی دلچسپی نہیں لینا چاہتی تھی۔

”آج رات کو وہ چابی مجھے دے دینا۔“ اس نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

”ابھی لو، رات تو ہو چکی، ساڑھے نو بج رہے ہیں۔ جناب، آپ پورے پانچ گھنٹے سوئی ہیں۔ اس کے پچھاس کے سامنے لہراتے ہوئے کہا۔

”لیکن نہیں، پہلے تم کچھ کھا لو، وگرنہ سے کھانا منگواتی ہوں، وگرنہ۔“ وہ رات کے دروازے سے جھانک کر نماز کو بانے لگی۔

”سنو شانو، مجھے کافی کے ساتھ بسکٹس یا ایک آدھ سینڈویچ منگوا دو، بس اور کچھ نہیں۔“ کافی آنے کے بعد وہ جلدی جلدی سینڈویچ نکلنے لگی۔ گرم گرم کافی کے بڑے بڑے گھونٹ کرتے ہوئے اس کی نظریں بے تابی کے ساتھ لمبی تقری چابیوں والے اس گچھے پہ پھسلتی

”تمہارے ساتھ۔“ اسے گرم شال اسیٹتے دیکھ کے شادور نے پوچھا۔ وہ نفی میں سر ہلاتی۔

”میں سب سے زیادہ تھکتی ہوں، تمہارے ساتھ نہیں رہنا چاہتی۔“ وہ نے اس کے سامنے کی لائن میں دو اسٹور روڈز کے درمیان بی بی نماز کے بعد کوئی اس طرف آنے کی ہمت نہیں کرتا تھا کیونکہ انہیں جلد سو جانے کی عادت تھی۔

مقدس کو ان کے تہجد کے لیے اٹھنے سے قبل واپس کمرے میں پہنچنا تھا۔ رابداری کا موزکات کروا کر وہ ایک لمبے کے لیے زکی۔ گولائی میں، نیچے لاؤنج میں نیم تار کی تھی لیکن وہ جانتی تھی کہ بائیں جانب باچا جان کے کمرے میں موجود نرس اور انڈینٹ ساری رات چوکے رہتے ہیں، سامنے کھانے والے کمرے اور ڈرائنگ روم کی لائینس بھی آف تھیں لیکن ان کے پیچھے وسیع کچن میں اس وقت تمام ملازما تھیں بلکہ پھلکی گپ شپ کے ساتھ سارے دن کا پھیلاوا سمیٹ

رہی ہوں گی اور دائیں جانب دراب چچا کے حصے میں بھی زندگی جاگ رہی ہوگی۔
 انوشہ اور پلوٹہ کے کمرے تو اوپر والے پورشن میں اس کے کمرے کے ساتھ ہی
 تھے، لیکن ان کے بھائیوں کے کمرے والدین کے ساتھ ہی متصل تھے۔ دراب چچا کی
 راتیں جاگتی تھیں اب بھی مردانے میں، جسے ان کے ہاں ”حجرہ“ کہا جاتا ہے۔ ان کے
 دوستوں کی محفل عروج پہ ہوگی۔ اگرچہ حجرہ اس عمارت سے باہر لان کے دائیں طرف
 بالکل الگ تھلگ ہے، لیکن مقدس جانتی تھی کہ چچی جان دراب چچا کی غیر موجودگی میں
 سوئی جاگتی کیفیت میں رہتی ہیں اور رات بھر اٹھ اٹھ کر کچن میں جا کر ملازموں کے ہاتھ
 کبھی چائے، کبھی قبوہ خشک میوہ جات کے ساتھ بھجواتی رہتی ہیں۔ اس لیے وہ نہایت
 احتیاط سے چلتی ہوئی اوپر کی طرف جاتی بیڑھیاں چڑھنے لگی۔ اس نے بیڑھوں کی ادا
 بھی آن نہیں کی، حتیٰ کہ ہاتھ میں دینی نارج کی مدد بھی نہ لی اور پر آگے اس نے اندر
 میں آنکھیں پوری کھول کر دیکھنے کی کوشش کی۔ اس نے اندر کی طرف لڑائی لڑائی
 سامنے کی طرف ٹیرس سے لائن میں چلتی لڑائی لڑائی کی روٹی آندھن کی آواز سنا
 ہی رات کے اس پہر کی ٹھنڈک تمام تر سناکی کے ساتھ بند یوں میں اترتی چلی جا رہی تھی۔
 وہ اس پورشن میں پہلی بار آئی تھی۔ یہاں باباجان کا بیڈروم، ان کی اسٹڈی اور اسٹوڈیو تھا۔
 اس نے سب سے پہلے دروازے میں ایک ایک کر کے چابیاں لگاتا شروع کر دیں۔ اگرچہ
 شناور نے اسے چابیوں کے نمبر بتا دیئے تھے لیکن تاریخ کی بوجہ وہ نمبر پڑھنے سے باز
 تھی اور کمرے میں جانے سے پہلے اسٹ جا مانا بھی نہیں چاہتی تھی۔ آخر کار چوٹھی چابی
 ڈالتے ہی لاک ایک لگی ہی آواز کے ساتھ کھل گیا۔

اس نے پینڈل گھما کے دروازہ دھکیلا، آسم استعمال ہونے کو پہلے سے دروازے
 چہرہ اہستہ ہی پیدا ہوئی اس نے سبم کے نوڈ کو ماسکٹ کر لیا۔ اس نے دروازے پر چڑھ کر
 لئے اطمینان کر لینے کے بعد اس نے دروازہ مزید کھولنے کی بجائے ترچھا ہو کے سرکتے
 ہوئے اندر آنا زیادہ بہتر جانا۔ اندر کی خنک تاریکی میں اس کے جسم پہ ایک نجیب سالرزہ
 طاری ہو گیا۔ کئی منٹ لگانے کے آہستہ آہستہ رگ رگ کے اس نے دروازہ دوبارہ بند کیا۔
 اس سے پہلے وہ اس کمرے میں کبھی نہیں آئی تھی۔ اس لیے اندازے کے ساتھ منولتی ہوئی
 کمز کی کے پاس آئی اور پردے ہا ابر کرنے کا اطمینان کیا تاکہ اندر کی روشنی باہر نہ جائے
 پہلے اس نے نارج آن کی۔ اگلی ذرا روشنی میں سفید سفید لے چوزے سامنے اسے نونہرہ

کر گئے۔ جلدی سے سوچ بورڈ پہ ہاتھ مار کے اکٹھے دو تین منٹ نیچے کر دیئے۔ نیوب لائٹ
 کے ساتھ ایک لیپ اور پکھا بھی آن ہو گیا۔ وہ لمبے سفید سائے دراصل جہازی سائز کے
 صوفوں اور بیڈ پہ ڈھکی سفید چادروں کے تھے۔ ٹکھے کی تیز ہوانے اس کے دانت
 کڑکڑا دیئے۔ پھر سے ٹکھے اور نیوب لائٹس کے من آف کرتے ہوئے وہ لیپ کی
 خوابناک روشنی میں کمرے کا جائزہ لینے لگی۔

شناور نے پہلے ہی بتایا تھا کہ اس کمرے میں اس کے بابا جان اور ماما کی کوئی تصویر
 موجود نہیں، مگر پھر بھی اس نے ڈریسنگ ٹیبل اور بیڈ کی سائیڈ ٹیبلز کی ایک ایک دروازہ کو کھنگال
 لیا۔ ان میں پرانے اخبار، چند ایک کاروباری نوعیت کی بوسیدہ فائلز اور رسالے موجود
 تھے۔ ڈریسنگ ٹیبل پہ کئی، چاندی کا جیولری باکس موجود تھا۔ دروازوں میں ڈھیروں
 پرانے اور بوٹھے گجرے چڑھے تھے، لیکن کپڑوں کے ماں باپ کی کوئی تصویر موجود نہ
 تھی۔ شاید کسی نے پورا کر لیا ہو، توں چھوڑے ہوئے صرف اس جگہ سے اس کی ماں کی
 موجودگی تھیں اثرات کو سنا کر کیا تھا وہ بگلی دروازہ کھول کے اسٹوڈیو میں داخل ہوئی۔
 دیواروں پہ کئی قدرتی مناظر مہارت سے چیت کیے ہوئے تھے۔ زمین پہ رنگوں کے ڈبوں
 اور نیوز کا خشک ہوا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ یہ کمرہ گرد سے آنا پڑا تھا، شاید صفائی کرنے والے نے
 صحرکار رخ نہیں کیا تھا۔

اس میں کھٹنے والی کھڑکی کا شیشہ شاید نیچے کی طرف سے ٹوٹا ہوا تھا اور اس درز سے
 باہر سے کچھ آواز آ رہی تھی۔ شیلٹ میں ڈھیروں الہمز اور ٹینیٹو پڑے
 ایک اسٹوڈیو کے دوران اسے ان تصویروں میں سے کچھ ایسے اسرار بر قیمت
 لگائے ہوئے تھے جو اس سے بلیکھائیں۔

لیکن اس سے پہلے کیوں نہیں اسٹڈی میں بھی ایک نظر ڈال ہی لوں۔ اس نے
 سوچا اور اسٹڈی کے دروازے میں چابی گھمائی۔ اگرچہ شناور پہلے ہی اسے آگاہ کر چکی تھی
 کہ اسٹڈی کی تمام بکس وہ دیکھ چکی ہے اور ان میں ایسی کوئی بات موجود نہیں جو اس کی
 الجھن ختم کر سکے، پھر بھی وہ طائرانہ نظروں سے تمام شیلٹوں اور الماریوں کا جائزہ لینے
 لگی۔ بلاشبہ کتابوں کی یہ کوئیکشن اس کے بابا جان یا ماما کے ذوق کی عکاسی کر رہی تھی، کہیں
 کلاسک انٹلکٹس لٹریچر کا خزانہ تھا تو کہیں جدید اردو شاعری کا ذخیرہ، سیاست، تاریخ اور
 مذہب پہ بھی لٹریچر موجود تھا۔ ایک بند الماری کے آگے وہ رزک کے کھڑی ہو گئی۔ شیشے میں

URDU PHOTO

سے نظر آتی سیاہ خنلیں جلد والی وہ موٹی موٹی کتابیں، جن پہ کوئی نام نہیں لکھا تھا، البمز بھی ہو سکتی تھیں اور ڈائریاں بھی۔ اس نے بے تابی سے تمام چابیاں ایک ایک کر کے اس میں گھمانے کی کوشش کی۔ لیکن بے سود۔ جھنجھلاہٹ سے اس نے ہنڈل کو کئی جھٹکے دیئے پھر مزید وقت ضائع نہ کرتے ہوئے دوبارہ اسٹوڈیو آگئی۔

ایک کے بعد ایک الہم کھولتے ہوئے وہ حیران ہوتی گئی۔ سوئٹزر لینڈ، فرانس، امریکا لینڈ سے لے کر اہرام مصر، خانہ کعبہ تک کے مناظر عکس بند کیے گئے تھے۔ تاج محل سے لے کر نیا گرافال کی رفتار تک کیمرے کی زد میں تھی۔ وہ دس بارہ البمز کھینچ چکی تھیں۔ لیکن اس سے سوائے اس راز کے اور کچھ ثابت نہ ہوا کہ اس کے بابا جان نہ صرف ایک حساس مضور ہیں، ایک ماہر فوٹو گرافر ہیں، بلکہ ایک سیلانی سیاح بھی رہ چکے ہیں۔ اس نے وقت کی کمی کے پیش نظر باقی البمز دیکھنے کا ارادہ باتوی کر دیا۔ کئی جان گئے تہہ کے لئے اٹھنے سے قبل وہ یہاں سے جانا چاہتی تھی اس لئے تمام البمز تیار تھیں۔ ایک کے بعد ایک میلا کچھلا سا تولیہ کسی کھوٹی پہ لگا تھا۔ تولیے کے گوشے پر لکھا تھا: "بہتر سے بہتر"۔ تجسس سے بے قرار ہو کے وہ جانے کا ارادہ ترک کر کے پھر سے اس طرف بڑھی۔ شاید کسی نے ارادتا ان البمز کو ذہک کے رکھا ہو، اس نے تولیہ کھینچا اور ان البمز کا جائزہ لیا، ایک تو پھولوں کی کسی نمائش کی تھی اور دوسرے کے نو کو سر کرنے والے کو بیٹوں کے کسی گروپ کی۔

اس نے سخت مایوسی کا شکار ہوتے ہوئے ڈھول میں اچھلنے لگنے سے روکے ہوئے بدرنگ تولیے کو دوبارہ کھوٹی سے لگانا چاہا تو وہاں جمبولتی ایک سہری چابی پہ اس کی نظر جم گئی۔ ایک زنجیر کے ساتھ دوسرے کو نے یہ دل نما کوئی چیز جمبول رہی تھی، اس نے چابی اُتار لی اور میکانیکی انداز میں اسٹڈی میں گھس گئی، مقفل الماری میں وہ سونے کی چابی گھماتے ہی ٹلک کی آواز آئی اور مقفل کا دل جیسے اچھل کر حلقوں میں چل گیا۔

اس کا اندازہ درست تھا۔ بابا جان کو مضور، سیاحت اور فوٹو گرافی کے ساتھ ساتھ ڈائری لکھنے کا بھی شوق تھا۔ ایک ترتیب کے ساتھ سال بہ سال لکھی سیاہ کور والی ڈائریاں اپنے اندر اس کے ہمہ صفت باپ کے کتنے راز چھپائے پڑی تھیں۔ چوہتر، پچھتر، تھیرتر سے ہوتے اس کے ہاتھ انیس سو اس کی ڈائری پہ رک گئے۔ یہ اس کی پیدائش سے ایک سال پہلے کا سن تھا اور یہی یہاں موجود ڈائری تھی۔ اس نے شمال کے اندر اسے کسی ستارہ عزیز کی طرح چھپایا اور جس خاموشی سے آئی تھی ویسے ہی واپس چلی گئی۔

☆☆☆

”خیریت تو ہے، بہت دیر لگا دی۔“ شادور حسب توقع اس کے انتظار میں دروازے پہ ہی تھی۔

”ایک گھنٹہ بھی نہیں لگا۔“ اس نے شمال ایک طرف پھینکی۔ وہ جس طرح ٹھہرتی ہوئی گئی تھی، اب اتنی ہی پسینہ پسینہ ہو رہی تھی۔

”کچھ ملا؟“ اس نے پانی کا گلاس اسے تھمایا جسے مشکور نظروں سے تھماتے ہوئے وہ اثبات میں سر بلا گئی۔

”یہ ڈائری“ اس نے ہاتھ میں پکڑی ڈائری لہراتے ہوئے گلاس لبوں سے لگا لیا۔ شادور نے کچھ اور کہنا فی الحال مناسب نہ سمجھا اور خاموشی سے اپنی رائٹنگ ٹیبل کی طرف بڑھ گئی اسے تو نہیں مکمل کرنا تھا۔

بجائے اس میں ڈبک کرنا پتی اگلیوں، دھڑ دھڑ کرتے دل اور پیاسی آنکھوں کے ساتھ اس نے ڈائری کھوٹی کر لی۔

۱۲ مئی ۱۹۸۰ء

تھکاوٹ سے جسم ٹوٹ رہا ہے اور یہ تھکاوٹ پورا ایک مہینہ گھر گزارنے کی ہے۔ پیر کے پچھلے کہیں تک کے بیٹھنے ہی نہیں دیتے۔ ایک مدت ہوئی گھر میں اتنا وقت گزارے ہوئے زور سانگہ باپ کی شادی، اتنے ڈھیروں کام۔ اتنی ذمہ داریاں..... بڑے لالہ بیٹا پیر کے پچھلے کہیں تک تھا تو دراب کالا سٹ سمسز دونوں کی تمام تر توجہ اسی جانب پا کے باچا جان نے کچھ نہیں لگا میں تو میں نے بھی اپنی سیلانی فطرت کو کچھ روز کے لیے تھپک کر دیا اور اپنی بڑی بہن کی شادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ بے جی، میری اپنی شادی میں کئی بیٹیوں سے پیار پیار کرتی تھیں حالانکہ بی بی جان سے ان کی کم ہی بنتی تھی۔ راسیاب لالہ کے بعد ان کے ہاں دو بیٹیاں ہوئیں تو گھر زیادہ دن جی نہ سکیں اور جب بی بی جان کے پہلوئیں کی جٹی ہوئی تو بے جی نے کتنی خواہش کی تھی کہ اب ان کے ہاں بھی ایک بیٹی ہو۔ زور سانگہ جیسی پیاری پیاری ہی، لیکن میں آ گیا ان کا دوسرا بیٹا۔ پھر وہ جتنا عرصہ زندہ رہیں بیٹی کے حصے کی ممتا انہی پہ لٹاتی رہیں، اسی لیے زور سانگہ باپ سے میرا تعلق اور گہرا ہو جاتا ہے ان میں مجھے بے جی کی خواہش کا عکس جھللاتا نظر آتا ہے۔ کتنے پریشان رہتے تھے سب ان کے لیے، وہ خاندان جس میں سولہ سترہ سالہ لڑکی کا بن بیٹا ہے رکھنا ہی ممنوعہ ہو وہاں میری بہن تیسواں سال شروع ہونے تک بھی..... خیر..... شکر ہے

رب العزت کا جس نے آفریدی خاندان کی نظر اس پر ٹھہرا دی۔ اس خاندان سے ہمارے اور بھی رشتے نکلتے ہیں اس حوالے سے یہ لوگ ہمارے لیے اجنبی بھی نہیں۔ اپنے ہی اپنوں کا بوجہ ہٹا کرتے ہیں، یہ بات بی بی جان اکثر کہا کرتی ہیں۔

رحیم گل آفریدی عمر میں زرسا نگہ باجی سے چند برس چھوٹا ضرور ہے، لیکن آفریدی اور خٹک خاندان میں اتنا کچھ ہوتا چلا آیا ہے کہ اب کچھ بھی انہونی بات نہیں لگتی۔ اب باچا جان کو وہی لیجئے۔ ان کے والد اور والدہ دونوں اپنے اپنے بھائیوں کی بیٹیاں لانا چاہتے تھے، باچا جان نے میری بے جی یعنی اپنی چچا زاد سے شادی کے ڈیڑھ برس بعد ہی بی بی جان یعنی اپنے ماموں زاد سے بھی نکاح کر لیا اور اس کے علاوہ..... اب کیا کیا لکھوں۔

رشتوں کی ڈور میں اتنے مل ہیں کہ ایک کا ذکر چھیر تو دوسرا وقت نکلتا چلا آئے۔ اس وقت میں سارے ماحول سے الگ تھلگ رہنے کی کوشش کرتا تھا۔ وقت خاندانی سرگرمیوں میں جا سیداد کی تقسیم کے تازے، وراثتی جھگڑے، وغیرہ وغیرہ میں نہ لگتا تھا۔ اس دوران میں بدلتے سال میں دو تین بار ایک آدھ ہفتہ یہاں رہنے چلا آتا تھا۔ اس بار ہی کچھ زیادہ دن لگ گئے۔ کل ہی شادی کے ہنگامے ختم ہوئے ہیں اور میں سخت بوریٹ محسوس کر رہا ہوں۔ آج رات سونے سے پہلے یہ فیصلہ کر کے رہوں گا کہ میرا کلا پڑاؤ کون سا ہوگا۔

۱۳ مئی ۱۹۸۰ء

کل رات جب میں اپنے متوقع سفر کے بارے میں سوچ رہا تھا تو مجھے سخت مایوسی ہوئی۔ مسرہ لبنان اور شام سے لے کے چین، ملائیشا، نیپال تک اور فرانس، امریکہ لے کر سوئٹزر لینڈ اور جاپان تک میں آدھی سے زیادہ دنیا گھوم چکا تھا اور ان ہی جگہوں پر دو بار ہجرت کا میرا کوئی موڈ نہیں تھا۔ میری آنکھ کھلنے سے پہلے ہی دو بار ہجرت کی سلیٹ پہ نقش ہو جاتا ہے اور میں ہو بہو اسے سینوس پہ آنکھ بند کر کے ہی اتار سکتا ہوں اس لیے کئی بار کی دیکھی جگہیں میرے لیے کسی دلچسپی کا باعث نہ تھیں۔ اسی ذہنی کشمکش میں مجھے فیروز خان وردگ کی آفریاو آئی۔

پچھلی سردیوں میں جب باچا جان کے ساتھ ان کے دوست بسم اللہ جان کی شکار کی دعوت پہ سوات گیا تھا تو وہیں فیروز سے ملاقات ہوئی تھی۔ بسم اللہ جان دانی سوات کے خاندان سے ہیں، سوات کے آخری ولی عبد کبیر میاں گل اور نگ زیب خان ان کے والد کے قریبی عزیز تھے، اسی حوالے سے پورے سرحد اور خصوصاً آزاد قبائل کے چیدہ

چیدہ خاندانوں کے خان مدعو تھے ان میں یوسف زئی بھی تھے، شہزادری اور خٹک بھی اور وردگ بھی، بعض ٹیمپل خان حضرات تھے بعض اپنے خول سے باہر آنے کی کوشش میں مصروف ان ہی میں فیروز خان وردگ مجھے چونکا گیا۔

غضب کا ذہن پایا ہے اس شخص نے، تعلیم اگرچہ اس کی رکھی ہی ہے لیکن اس کی ذہنی اپروچ اور پختون تاریخ کے بارے میں اس کی معلومات قابل رشک ہیں، بہت کم وقت میں اچھی خاصی دوستی ہو گئی، میری اس سے۔

میرے سیاحت کے شوق کے بارے میں جان کے اس نے مجھے آفر کی تھی کافرستان وادی کی تلاش کے دورے کی، اس کی زبانی وہاں کے واقعات سن سن کر میں تو تب ہی ارادہ کر چکا تھا جانے کا لیکن فیروز نے منع کر دیا کہ سردیوں میں برف باری وہاں تک کے تمام راستے مسدود کر دیتی ہے، ان علاقوں میں جانے کا آئیڈیل وقت مئی سے ستمبر تک کا ہے۔ اس سے کیا وعدہ یاد آنے پر میں نے فوراً ہی وہاں جانے کا ارادہ کر لیا ہے۔ کل ہی صبح فجر کے بعد میں پشاور سے سوات کے لیے روانہ ہو جاؤں گا۔ انشاء اللہ

۱۳ مئی ۱۹۸۰ء

اس وقت میں فیروز خان کی سفید اینٹوں سے بنی حویلی کے مردان خانے کے منقش جالی سے باہر سے گیس لیمپ کے نیچے بیٹھا یہ ڈائری لکھ رہا ہوں۔ رات گئے تک فیروز کے دستوں کی محفل جی رہی میری آمد کی خوشی میں اور اب وہ مجھے گھنٹہ دو گھنٹہ آرام دینا چاہتے ہوئے گیا ہے، تاکہ صبح کا اجالا پھیلے ہی سفر پہ نکل جائے، لیکن میں بھلا

پورے سوات آئے جے کے درمیان ہی سوات پہنچ گیا تھا لیکن فیروز کے گھر شام کی رہائش سوات کے صدر مقام سیدہ شریف میں ہے وہاں تک پہنچ کے اس کی حویلی چاہتے ہوئے عجیب سی جھجک نے مجھے آن گھیرا اور میانی عرصے میں، میں نے اس سے کوئی رابطہ نہ رکھا تھا اور اب اچانک اسے میزبان کا شرف بخشے پہنچ رہا تھا۔ یہ سوچ کر میں نے کسی ہوٹل کی راہ لینے کا فیصلہ کیا۔ سیزن ہونے کی وجہ سے سرینا، مرغزار اور پنی ڈی سی جیسے پائے کے تمام ہوٹل بک تھے۔ میں نے نسبتاً درمیانے درجے کے "ریٹیم" میں کمرہ بک کر دیا اور وہاں پہنچ کے فیروز سے رابطہ کیا لیکن وہ گرم جوش پٹھان زادہ میری آواز سنتے ہی دیوانہ ہو گیا۔

اور چند منٹ کے اندر اندر مجھے لینے آ گیا۔

سوات کے پُر رونق بازار گھماتا ہوا وہ مجھے اپنی حویلی لے کے آیا۔ پُر تکلف پکوانوں، خوشبودار قبوؤں کے درمیان گپ شپ لگاتے کب رات بیت گئی پتہ ہی نہیں چلا، اب مجھے تھا کوٹ سی محسوس ہونے لگی ہے۔ میرا خیال ہے کچھ دیر کمر سیدھی کر ہی لی جائے۔

۱۵ مئی ۱۹۸۰ء

اور اس وقت میں گویا جنت کے ایک قطفے پہ بیٹھا خود کو یہ یقین دلا رہا ہوں کہ میں واقعی اس منظر کا ایک حصہ ہوں۔ مجھے حیرانی ہے کہ پشاور میں رہنے کے باوجود میں اپنے اس قدر قریب واقع ان حسین دادیوں سے اب تک انجان کیسے رہا، دنیا بھر سے لوگ نجانے کتنا کتنا لمبا سفر طے کر کے یہ جنت نظیر مقام دیکھنے آتے ہیں، فیروز نے بتایا۔

”سوچیان، فاحان، سامگ یون، ہیون کھاٹک اور اٹاگیا۔ ان کے سفر نامے کیا پڑھنے کے چپے چپے کے قسیدوں سے بھرے پڑے ہیں۔ بدھ مت کا بچک بچک مقام بھی ہے۔ دنیا بھر سے بدھ مت کے ماننے والے یہاں اپنی مذہبی سوجھ بوجھ کے لیے آتے ہیں۔ سوات کا ایک سابق بادشاہ ”اجی تابا“ بدھ مت کا مذہب رہنما بھی تھا اور ان لوگوں کا عقیدہ ہے کہ وہ کبھی نہ کبھی ضرور واپس لوٹے گا وہ دن بدھ کا اور تاریخ ۲۶ ہوگی۔“

اس کے علاوہ بھی اس نے ان اطالوی، فرانسیسی اور برطانوی سیاحوں کے اقتباسات سنائے جو سوات اور کالاش سے مسکور ہو کے رہے تھے۔ جتنا میں بھی اس وقت زہنگ رہ گیا تھا، جب سید و شریف سے تقریباً ہولکومیسٹر کے فاصلے پہ واقع مشہور چوٹی۔

فلک سیر“ میری نگاہوں کے سامنے آئی۔ میرا تو دل ہی نہ چاہتا تھا اتنی جلدی وہاں سے کوچ کرنے کو لیکن سفر طویل بھی تھا اور پریچ و شوارنگز اور بھی۔

”تم کہاں کہاں رکو گے۔ یہاں سے ایوان تک کا راستہ میں چھوڑیں گے اور اور ٹھہراؤں، آبشاروں سے بھر پڑا ہے۔ لیکن اب ہمیں ایوان تک بغیر زکے سفر کرنا ہے۔“

فیروز نے تسبیہ کی۔

”ایوان؟“ میں اپنی اٹلی پہ خاصا شرمندہ تھا۔

”ہاں چترال سے آگے یہ سب سب گاؤں کا فرستان کا دروازہ کہلاتا ہے۔ یہاں سے ہی کیلاش کی دادیوں کو راستے نکلتے ہیں۔“

”کیا یہ کوئی ایک وادی نہیں ہے۔“

”نہیں وادی کیلاش، بمبوریت، بریر اور ریمبور نامی تین حصوں پہ مشتمل ہے۔ تینوں کا قدیم مذہب آتش پرستی اور ناگ پرستی ہے۔ لیکن یہ لوگ تین قبیلوں میں بنے ہوئے ہیں بظاہر ان کا بودو باش ایک سا ہے، لیکن بمبوریت نسبتاً ترقی یافتہ کہلایا جاسکتا ہے۔“ ایوان پہنچ کر فیروز نے جیب اپنے ایک جاننے والے مقامی شخص کے جوالے کی۔ ”ان راستوں پہ ڈرائیونگ صرف یہاں کے ماہر ڈرائیور ہی کر سکتے ہیں۔“

”تو اب ڈرائیور کہاں سے لیا جائے۔“ اندھیرا پھیلنے کی وجہ سے میں ٹکر مند تھا۔

”چلو اڑے چلتے ہیں، وہاں دن میں ایک دو بار دیکھن آتی ہے اور مسافر بھر کے“ دو باش“ لے جاتی ہے۔“ اڑے پہ کئی سیاح گرہ پ بنائے کھڑے تھے، کچھ ہی دیر میں ایک بس آئی اور سب لوگ کراہی ملائے ڈرائیور کو دینے کے بعد اپنے اپنے سامان سمیت اس پہ سوار ہو گئے۔ فیروز کا کہنا درست تھا واقعی اس پُر خطر پہاڑی راستے پہ ڈرائیونگ کرنا ناٹائی شخص کے لیے ہونگی تمنا۔ دو باش کے مقام پہ فیروز کا ایک مقامی دوست ڈان خان جیب لیے کھڑا تھا۔ سخی سا وجود، سرخ و سفید رنگت، بادامی شلوار سوٹ پہ براؤن جیکٹ سپروں سے بھری ہوئی قلنسوی والی روایتی ٹوپی کے ساتھ وہ خوش مزاج شخص، حد سے زیادہ مہمان نواز لگ رہا تھا۔ راستے میں میں نے آہستہ آواز میں پوچھا۔

”یار ایروز خاننا، یہ بندہ ڈان خان کیا ہے؟ میرا مطلب ہے ڈان بھی اور خان بھی۔“

”تو بدھ مت نام ہے تو پھر یہ خان؟“ وہ زور سے ہنس پڑا۔

”یہ نام سننے کو ملیں گے کہ بس۔ یہ بدھ مت کا نام ہے۔ بدھ مت کے نام رکھ لیتے ہیں۔ نہ مطلب کھگانے کی فکر، نہ مذہب و قوم کا خیال۔ یہاں آگے والے پتھر کی سیاحوں کے نام پہ بھی یہ اپنے بچوں کے نام رکھ لیتے ہیں۔“

”یہ ڈان خان شیخ مسلم ہے۔ یہ کیلاش کے قبضے کا رہنے والا ہے، بمبوریت کی کافر آبادی سے نہیں، میں نے کہا ناں یہاں دو تہذیبوں کا میل ہے۔“

”قبائلی لوگ اکثر تو مسلمان ہی ہیں، سیکھ اور اکانڈا کا ہندو بھی نظر آ جاتے ہیں۔ ان کی زبانیں پشتو کے علاوہ گوجری، کوہستانی اور کشمیری بھی ہیں۔ یہ قدرے تعلیم یافتہ اور تہذیب پسند ہیں، لیکن کالام حقیقی معنی میں کافرستان ہے۔ صدیوں سے چلی آرہی اپنی تہذیب و تمدن اور مذہب میں یہ رتی بھر تبدیلی کرنے پہ تیار نہیں۔ یہ اپنا مخصوص لباس پہنتے ہیں، اشوجی اور گاروی زبان بولتے ہیں اور اپنی قوم میں کسی انقلاب اور جدت کے سخت خلاف ہیں۔ ہاں

ناموں کے سلسلے میں یہ اصول کچھ کمزور ہیں۔ یہاں کوئی ڈیوڈ ہے، کوئی رام، کوئی پھول خان ہے تو کوئی گوبھی خان، کوئی سکندر ہے تو کوئی بندر۔

”ڈونٹ ٹیل می یار۔“ میں ہنسنے لگا۔

”ابھی دیکھنا راتم“ اس نے گیٹ پہ بیٹھے چوکیدار کو پشتوں میں مخاطب کیا۔

”سنگے ایران چا چا؟“ (کیسے ہو ایران چا چا؟)

”خیر رائے، خیر رائے۔“ (خوش آمدید، خوش آمدید) وہ اس کے ہاتھ پوتتا

ہو اسی کے ہاتھ پوتتا۔

”یہ کمانڈر خان ہے اور یہ اس کا بھائی جرنیل خان۔“ اس نے آٹھ سال کی عمر کے دو

جزواں لڑکوں کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ ژان کے بھائی پان خان کے بیٹے ہیں اور یہ

بجر کا بھائی، غضب کا فنکار ہاتھ ہے اس کا، انجیر نام لے اور (بستر جناح) لے لے لے لے

ڈرائیور ہیں، یہی ہارے گا سید کا کام بھی کریں گے۔“

اس نے فردا فردا ان سب دلچسپ ناموں اور چیزوں کا تعارف دیا اور پھر

میں چلے آئے۔

رات کے سائے پھیل رہے تھے، لیکن تاریکی اس حین کو میری نظر سے پوشیدہ نہیں رکھ

سکتی جو صبح کے پہلے اجالے کے ساتھ میرے حواسوں پہ چھانے والا ہے۔

۱۶ مئی ۱۹۸۰ء

داوی کیا اش میں آج صبح کی پہلی کرن کے ساتھ بیدار ہونے والا میں پہلا شخص تھا

شاید میں تو سورج کے ٹھاؤں ہونے سے بھی پہلے ہی بجر کے کمرے سے باہر نکلا آیا تھا۔

نیلکوں تاریکی میں پڑھنے تک میں جبرے کے احاطے میں نہ جا سکتا تھا۔

ہاں کی فرحت افزا اور خوشبوؤں بھری فضا کی تازگی اپنے اندر

فیروز کے سونے کے انداز سے تو ظاہر ہوتا تھا اور دو تین گھنٹے تک جاگنے کے موڈ میں

نہیں۔ میں اسے جگاتے جگاتے رہ گیا، یہی کم تھا کہ وہ دوستی اور میزبانی کے تقاضے نبھاتے

ہونے میرے ساتھ یہاں تک چلا آیا تھا۔ اپنے کاروبار اور بیوی بچے کو چھوڑ کر، جیسے

ذمہ داری سے آزاد، بے فکر سے سیاحت کا ساتھ دینے کے لیے۔ اتنی صبح میں اس کی نیند خراب

کرنے کا ارادہ میں نے ترک کر دیا۔ ایران چا چا بھی شاید رات بھر کی چوکیداری کے بعد

اپنے کوارٹر میں جا چکا تھا۔ ڈور ڈور تک کوئی ذی روح نظر نہیں آ رہا تھا۔

مرغ کی کڑک دار بانگیں پرسکون فضا کا سینہ چیرے دے رہی تھیں۔ مرغ کی آواز کے ساتھ ہی مجھے سید شریف میں گزاری رات یاد آگئی۔ جب فیروز خود بھی حلق تک بھنی مرغ ٹھونس رہا تھا اور مجھے بھی لے تھا شا کھانے پہ مجبور کر رہا تھا۔ جب میں نے اسے نوکا کہ ”کیا آج سے پہلے کبھی مرغی نہیں دیکھی، یا آج کے بعد دیکھنے کو نہیں ملے گی کیا، جو دیگر پکوان چھوڑ کر بے چاری مرغی کی جان کے دشمن بنے ہوئے ہو۔“ تو اس نے ایک دلچسپ انکشاف کیا تھا۔

”کیلاش میں باورچی، نائی اور چوکیدار وہاں کی مقامی آبادی کے ہوتے ہیں اور کافرستان کے مذہب میں مرغ حرام ہے۔ اس لیے کسی کیلاش باورچی کے ہاتھ میں مرغ پکانے کے لیے دینا گویا اس کی مذہبی عقیدت پہ وار کرنا ہے اس لیے خوچہ جتنی مرغی کھانی ہے آج ہی کھا لو نجانے اور کتنے ہفتے ڈالتے اور ٹھنیں کھانی پڑیں۔“

اس کا نذیر سے اپنی لڑکی پہ مرغی لے کر آنا یاد کر کے میرے لبوں پہ مسرت آگئی۔ ذور کہیں سے فجر کی اذان سنائی دینے پر میں لکڑی کا پھانک کھول کے سرمئی پتھروں والی گلی میں آ نکلا۔

ہاٹنے ڈھلان کی جانب سے ایک سیاہ پوش وجود بغل میں گھردنچی دبائے قدم بہ قدم بھر رہا۔ وہی وی یا میگزینز میں کلام کے اس روایتی لباس اور زیور کے ساتھ کئی بار وہاں کی شہزادوں کو رکھا تھا لیکن..... پہلی بار ایک کالا شہزادہ کو آتے دیکھ کے میرے قدم خود بخود دھرتی پہ ٹپکے۔ وہ لے لے لے لے ڈگ بھرتی میرے مقابل آن کھڑی ہوئی۔ گلیجے سے اُجالے اور ذی انداز خندیں اس کے منہ سے واضح نہ تھے۔ لیکن قد آدرا سا مکمل خود اعتمادی کے ساتھ اپنے منہ سے کہا۔ اس کے لبوں سے ہند تا قابل فہم الفاظ والا ایک جملہ نکلا تھا شاید اس نے اپنی مقامی زبان میں گھردنچی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کچھ کہا تھا۔ میں احمقوں کی طرح دیکھنے لگا۔ لڑکی سمجھ دار تھی، میرے کچھ کہے بغیر ہی سمجھ گئی اور اب کے پشتوں میں مخاطب ہوئی۔

”بکری کا تازہ دودھ ہے مہیب، کتنا لوگے؟“ اپنی مادری زبان میں اسے بولتے دیکھ کے مجھے عجیب سے احساسات نے آن گھیرا۔ پوری دنیا گھوم چکا تھا میں، مختلف ممالک میں بھانت بھانت کی لڑکیوں سے واسطہ پڑا تھا مجھے، بھنورا صفت یا رنگین مزاج کہتا تو کس طور جائز نہ ہوگا۔ بہر حال صنف نازک سے قطعی پرہیز مجھے بھی نہیں رہا۔ اٹلی کی سلویا اور قاہرہ کی نبوا سے میری اچھی خاصی دوستی رہی، لیکن کیا کیا جائے رگوں میں اُلتے اس خون کی تاثیر کا۔



میرے اندر کا پختون زادہ اپنی فضاؤں میں آ کے پورے کروفر سے سر اٹھالیتا تھا۔ اپنی برادری اور خصلت کی خواتین کو سامنے پا کے میں کبھی بھی بے تکلفانہ گفتگو نہیں کر سکتا تھا۔

ہمارے خاندان میں فرسٹ کزنز سے بھی نر کے ایک حصے میں آ کے پروہ کر لیا جاتا ہے۔ حویلی کے زنانہ اور مردانہ حصوں کے ملازمین تک کے سلسلے میں احتیاط کی جاتی ہے۔ جس طرح ہمارے زنان خانے میں مرد ملازم کا جانا محال ہے، اسی طرح بی بی جان مردان خانے اور حجرے میں گھریلو ملازموں کا جانا بھی پسند نہیں کرتیں اور اب سحر کی اس اوبلیں ساعت میں، دُور دُور تک پھیلے سناٹے اور تنہائی میں ایک لڑکی کو خود سے ڈیڑھ فٹ کے فاصلے پہ اپنی مادری زبان میں خود سے مخاطب پا کے میں ایک لمحے کے لیے بھول ہی گیا کہ وہ ایک غیر قوم، غیر مذہب لڑکی ہے۔ قندازا سنا ایت چاہت ہے کہ میں نے اندر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”اندر جا کے گھر کی خواتین سے پوچھ لو۔ انہیں خبر ہو جائے گی۔“

طرف قدم بڑھایا اور ایک ٹولٹی ہوئی مگر سرسری سی نظیر جو یہ ڈال۔ شہب کا آخوند تھا اس کی بے پرواہ چال میں۔ میں آگے بستی کی طرف بڑھ گیا۔ دو گلیاں پرے ایک کچی مسجد میں فجر کی نماز ادا کی اور ٹہلتا، وہاں واپس آ گیا۔

ناشتا ڈان خان کے گھر کے اندرونی حصے میں ہوا۔ میں گویا خستین کی موجودگی میں کچھ ان ایزی فیل کرتا رہا، لیکن شاید ڈان کی ماں، بہنیں وغیرہ سب نیرور سے خاصی بے تکلف تھیں۔ وہ پشتو نہیں جانتی تھیں اور میں ان کی زبان سے نابجا، البتہ نہ وزلو نے پوچھے، الفاظ، کچھ ہاتھ کے اشاروں کے ذریعے اور کچھ ڈان کے ہتھیوں کمانڈر اور جرنیل کی مدد سے مسلسل شامل گفتگو رہا۔ ناشتے کے دوران کیلاش ملازمہ چائے اور دو چار دسترخوان بچھانے، کوئی گرم روٹی پیش کرنے۔ ایک وہی بیٹی پھیل کاٹ رہی تھی۔ اور دو چار نو عمر لڑکیاں کونے میں لگیں کھس پھس اور کھی کھی کر رہی تھیں اور فیروز کے قدموں پہ کھٹکھٹانی رہی تھیں۔ اس نے میرا گریز بچانے کے لیے مجھے گفتگو میں شریک کرنا چاہا۔

”یارا زریاب تو ان کے نام نہیں پوچھے گا۔ ذرا دیکھ تو سکتا سن و شباب کے ان شاہکاروں پہ لیبل کیا کیا لگے ہوئے ہیں۔“ میں نے مسکرا کے ہلنا چاہا، مجھے خواتین کو یوں تختیر بھرے انداز میں مونسو گفتگو بنانا پسند نہ تھا پھر چاہے وہ کوئی آن پڑھ، گھریلو ملازمہ یا کافر پہاڑن ہی کیوں نہ ہو، لیکن شاید وہ لوگ بھی ان وہ شیرازوں کے ساتھ چھیڑ چھاؤ کے عادی

تھے اور وہ بھی ان صاحب لوگوں کے ساتھ خاصی گھمبلی ہوئی لگ رہی تھیں۔

”یہ دیکھو سب سے پہلے تمہارا اتھارف ”غٹ شنڈے“ سے کراتا ہوں۔“ اس نام پہ میں نے بے ساختہ سر اٹھا کے سامنے دیکھا اور اس مسکراتی ہوئی اجڑی لڑکی کو دیکھ کے ہنسی اپنی ہنسی ضبط کر رکھا۔ جس نے بھی یہ نام رکھا تھا بڑا ہی ”برجستہ“ رکھا تھا۔ اس کے چہرے پہ کوئی چیز اگر نمایاں تھی تو وہ عنابی رنگ کے خاصے بڑے بڑے ہونٹ تھے جو پہلے دانتوں کو خاصی حد تک ڈھانپتے ہوئے تھے اور اس کی آنکھیں بلاشبہ بے حد شفاف اور معصوم سی تھیں لیکن لمبے لمبے پیلے دانتوں اور مونے لٹکے ہوئے ہونٹوں کا کبھی نیشن اس کی آنکھوں کا حسن غارت کر رہا تھا۔ ”غٹ“ پشتو میں بڑا کوا اور ”شنڈے“ ہونٹ کو کہا جاتا ہے۔ یعنی کبھی پشتو زبان نے اسے یہ نام دیا، وہاں اور اس کے ماں باپ نے بغیر مطلب جانے اسے تمنغے کی طرح اس لیے جاری کیا۔

”اور یہ ہیں مس لندن“ اس نے بارہ تیرہ برس کی دہلی پتلی سی شریلی بچی کی طرف اشارہ کیا۔ ”اور ایک مس پیرس بھی، دوتی ہیں وہ آج اتفاقاً غیر حاضر ہیں۔ یہ نام یہاں آنے والے غیر ملکی سیاحوں سے متاثر ہو کر رکھے گئے ہوں گے۔ بے تکلف ہونے میں تو یہ بڑا کمال رکھتی ہے۔ بنا زبان سمجھے جانے یہ ہر ملک سے آنے والے لوگوں سے کھل مل جاتی ہے۔ انہیں اپنی تقریبات میں مدعو کرتے ہیں اور بدلے میں اور کچھ نہیں تو ان کے لیے نام لے لیا جاتا ہے اور یہ... یہ دیکھو۔“

”یہ بچی کی لنگھی تمام سے آگے کیا۔“

”کیا اسے دیکھنے کی قدرت کی فیاضی پہ ایمان لانے کو جی نہیں چاہتا؟ لیکن جانتے ہو اس کا نام کیا ہے؟“ غریبی میں نے نظر بھر کے اس بچی کو دیکھا۔ کون سا رنگ تھا فطرت کا جو خدا نے اس کے چہرے پہ سجائیں دیا تھا۔ سبز آنکھیں، گلابی ڈورے، سرخ گال، مرمریں ہونٹ، بھورے بال، سنہری جلد اور نام غریبی میرے دل کو کچھ ہونے لگا۔ میں نے جیب سے ایک پانچ سو کا نوٹ نکال کے بچی کے منہ سے سنے ہاتھ میں تھمایا اور کہا۔

”اس کا نام ”اندول“ ہے۔ اس کی ماں سے کہہ دینا۔“ اور اٹھ کے باہر نکل آیا۔ کنویں کے پاس ”کپے“ میں ایک اور سیاہ پوش لڑکی ویٹل کی گنزدہ بچی کھٹال رہی تھی مجھے یونہی شبہ سا ہوا کہ یہ وہی بیچ والی لڑکی ہے۔ ذرا قریب جا کے میرا شبہ یقین میں بدل گیا۔ اگرچہ صبح کے

URDU PHOTO

ذہند لکے میں اس کے نقوش نہیں دیکھ پایا تھا لیکن مدہم نروں میں گنگناتی اس کی آواز میں فوراً پہچان گیا۔ میرا ارادہ اچاٹے سے گزر کر سامنے ایران چاچا کے پاس جا کے گپ شپ لگانے کا تھا کہ وہ واحد بلازم تھے جو پشتو بول سکتے تھے، لیکن نجانے کیوں میرے قدم اس کے قریب آ کے رک گئے۔

”اور تمہارا نام کیا ہے؟“ اچانک میں نے اپنی آواز سنی۔ اس نے ذرا سا سر اٹھایا کر کے نظر مجھ پر ڈالی۔ گھڑوچی سے پانی جھاڑا، گیلے ہاتھ اپنے گھیردار کرتے سے پونچھتے ہوئے وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”مومنہ علی“ پر اعتماد لہجے میں جواب دیتی ہوئی وہ آگے کو قدم بڑھا گئی اور میں جو کسی عجیب و غریب نام کا شکر تھا۔ مومنہ علی سن کے ذہنک رہ گیا اور جان کا تہان کھڑا اس نام غور کرتا رہا۔

”کیا ہوا؟ کہاں گم ہو؟“ فیروز میزے نزدیک آیا۔
”کچھ نہیں، یار مذاق سے قطع نظریہ لوگ واقعی بے رحمی کے سلسلے میں بہت لاپرواہ لگتے ہیں۔“ میں بڑبڑایا۔

☆☆☆

”مومنہ علی“

مقدس کی نظریں پھر سے دوسطریں اوپر پھسل کر ”مومنہ علی“ پر پڑ گئیں۔ اس نے زبیر کو لب یہ نام دہرایا۔

”اللہ اکبر..... اللہ اکبر“

فجر کی اذان کی آواز ماحول کے ہر احساس پہ حاوی ہو گئی۔ اسے شروع ہی سے صبح صادق کے تلکے اُجالے میں اذان سنا بے حد اچھا لگتا تھا۔ بابا جان کو بھی تو وہ... مومنہ علی فجر کی اذان کے سے... اور اب مجھے بھی، اس وقت اس کی ذہنی رد بھنک کر پھر وہیں چلی گئی تو سر جھٹک کے وضو کرنے کھڑی ہو گئی۔ نماز ادا کر کے اس نے دعا کے لیے ہاتھ بلند کیے۔ آج سے پہلے اس نے خود کو کسی اتنا جہی دست نہ محسوس کیا تھا، یہاں تک کہ دعا مانگنے کے لیے اس کے کھٹکول میں الفاظ کے سکتے بھی نہ تھے۔ وہ کیا مانگتی۔

ماں باپ کی سلامتی اور ان کی لمبی عمر کی دعا۔

یا۔

پھر ان کی مغفرت کے لیے۔

”نہیں، نہیں۔“ وہ لرز گئی۔ ”یا اللہ میں نہیں جانتی میرے ماں باپ کہاں ہیں اور کیوں ہیں، وہ کیا وجہ ہے جس نے انہیں مجھ سے خائف ہو کر اپنی اپنی زندگی الگ الگ گزارنے پہ مجبور کر دیا ہے۔ میں یہ بھی نہیں جانتی کہ مجھے ان سے لاعلم رکھنے میں تیری کیا مصلحت ہو سکتی ہے۔ لیکن یا مسبب الاسباب مجھے ایک بار صرف ایک بار ان سے ملو اڑے۔ میں ایک بار..... زندگی میں صرف ایک بار ان کی آنکھوں میں اپنا عکس دیکھنا چاہتی ہوں، ایک بار ماں کی آغوش کی گرمی محسوس کرنا چاہتی ہوں، ایک بار اپنے سر پہ باپ کے ہاتھ کا سایہ محسوس کرنا چاہتی ہوں۔“

میں جانتا چاہتی ہوں وہ ٹھنڈک کیسی ہوگی جو ان ہاتھوں تلے پھیلی چھاؤں میں ہے۔ میں جانتا چاہتی ہوں وہ گرمی کتنی پر سکون ہوگی جو ماں کی پھیلی ہوئی بانہوں کی پناہ میں ہے۔ میں جانتا چاہتی ہوں کپنپاتے لبوں کا وہ بوسہ کتنا حیات بخش ہوتا ہوگا جو اولاد کے ماتھے کا مقدر بنتا ہے۔ یا اللہ تو سب جانتا ہے..... کیا میرے ماتھے کے نصیب میں وہ بوسہ ہے؟ یا اللہ رحیم و کریم پروردگار بس ایک بوسہ ذرا سی گرمی تھوڑی سی چھاؤں میرے نصیب میں بھی۔“

ت بھر کی جاگی آنکھیں خدا کے حضور گریہ زاری کے بعد اتنی متورم ہو گئیں کہ اسے چند سیکنڈ کھولے رکھنا بھی دشوار ہو گیا۔ دل میں برسوں سے دبی خواہشوں کو جب اس نے ذرا سے مالتو تڑوچ تک شانت ہو گئی۔ اس نے مندی آنکھوں کو کھولنے کی کوشش کی۔

”یہ کیا ہے؟“ اس نے پوچھا۔
”یہ ایک ایسا کونا موڑ ہے اس پہ بے سدھ ہو گئی۔“
”یہ کیا ہے؟“ اس نے پوچھا۔
”یہ ایک ایسا کونا موڑ ہے اس پہ بے سدھ ہو گئی۔“

”اٹھیے محترمہ، گیارہ بج رہے ہیں۔ بہت سولیا۔ اس طرح راتیں جاگ جاگ کے اور دوپہر چڑھتے تک سونے کی نادائیں کچی کر لیں تو بوی پر اہلم ہو جائے گی۔ واپس تو باٹل میں جاتا ہے نا، اب پٹھیاں ہی کتنی باقی رہ گئی ہیں۔“

اس کے اتنا کہنے پہ مقدس ہو یہ یاد آئے کہ وہ ہاسٹل کے کمرے میں نہیں بلکہ پشاور میں موجود ہے۔ اس نے بازوؤں پہ رعنا سرانجاما کے اٹھنے کی کوشش کی تو کراہ نکلی گئی۔ کئی گھنٹے ایک ہی پوزیشن میں سونے کی وجہ سے گردن اور شانے کے پٹھے کھینچ سے گئے تھے اور کلائیوں تک ہاتھ سنبھلے تھے۔ نماز کی چادر اس طرح سر کے گرد لپیٹی تھی اور یہ کپسل۔ یہ تھینا شانوں نے ہی اوڑھایا ہوگا۔ وہ مسکرائی۔

”سنو، کچھ خاص بات پتہ چلی ڈائری سے۔“ اسے کھڑکی سے پاس روٹن ڈھوپ میں قدرے ہشاش انداز میں کھڑا دیکھ کے شنابر نے پوچھا۔

”ابھی تک تو نہیں۔“ وہ فنی میں سر ہلاتے ہوئے بید پہ آ کے بیٹھ گئی۔ ”میرا خیال ہے میں نے فنڈول اتنے گھنٹے برباد کیے۔ یہ تو ڈائری کم اور کوئی سفر نامہ زیادہ لگ رہا ہے۔“

”وہاں اور بھی تو ڈائریاں ہوں گی۔“

”ہاں لیکن مجھے یہ اس لیے متوجہ کرانی کہ ایک تو یہ میری پیدائش سے ایک ڈیڑھ برس پہلے ہی پرانی ہے، یعنی تقریباً اس دور کی جب بابا جان نے پشاور سے لاہور کو سفر کیا اور اپنے

والے ہوں گے اور دوسری وجہ یہ تھی کہ یہ ان کے ہاتھ کی تھی اب تک کی آخری ڈائری ہے اس لیے میں نے سوچا تھا کہ اس میں نکلے حالات و واقعات ضرور ان حقائق سے پردہ اٹھادیں گے جو اب تک میری نظر سے مخفی ہیں، یار کھے گئے ہیں لیکن.....“

اس نے ڈائری کے اوراق بے دلی سے لٹنے۔

”اس میں تو سوات، کالام اور نجانے کن کن وادیوں کے مفیدے لکھے ہوئے ہیں۔“

عسکروں، آبشاروں، ندی نالوں کے تذکرے وغیرہ وغیرہ۔“ اس کے لہجے میں مایوسی محسوس کی جیسے جھٹک کے وہ بٹکے پھٹکے انداز میں بولے۔

”ویسے ایک بات ہے یار۔ بابا جان میں ایک چھوٹا سا راز ہے۔“

ملاہٹیں موجود ہیں۔ جو بات میں جاننا چاہتی تھی اس کا اس ساری تحریر سے کوئی تعلق نہ ہونے کے باوجود میں کس طرح گھنٹیوں اس کے مطالعے میں مصروف رہی یہ میں بھی نہیں جانتی۔ انہیں تو متحور ہونے کے بجائے منصف ہونا چاہیے تھا۔“

”تمہارے بابا جان آرٹسٹ ہیں اور آرٹ کے کسی بھی ایک شعبے سے تعلق رکھنے والا شخص دوسرے فنون لطیفہ سے نااہل نہیں رہ سکتا۔ میں نے ماموں کے پیٹ کیے ہوئے لینڈ اسکیپ بھی دیکھے ہیں اور وہ خوب صورت لحات بھی جو انہوں نے کمرے کی آنکھ سے قید

کیے ہیں اور یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ انہیں خوب صورتی اور وہ بھی فخری خوب صورتی بہت ازیٹ کرتی ہے۔ لازمی ہی بات ہے کہ اس کا اظہار ان کی تحریر میں بھی ہوتا ہوگا۔ جس خوب صورتی کو وہ موقنم کے ذریعے نہ ابھار سکتے ہوں گے اسے قلم کے ذریعے خراج تسمین پیش کرتے ہوں گے، لیکن تم یہ باتیں کیا جانو..... ایک آرٹسٹ کی فیکٹرز وہ سہرا آرٹسٹ ہی جان سکتا ہے۔“ اس نے شوہری دکھائی۔

”اچھا اب یہ فن اور فنکاری چھوڑو اور میرے لیے کچھ ناشتے کا بندوبست کرو۔ سخت جھوک لگی ہے۔“

”بہت اچھے..... مقدس خانم بہت اچھے مجھے کیا اپنی کینز خاص سمجھ رکھا ہے۔ رات کو توباری دگرگوں حالت پہ رحم کرتے ہوئے گالی کا کپ کیا لاتھا اور صبح یہاں کارپٹ پہ

لے بیٹھے پڑے گئے کپال کیا اور پھر دیکھنے لگے اپنی خادمہ ہی تقو رکھ لیا۔ چلو اٹھو خانم..... اور اپنی پیٹ بوجا کا انتظام چھو کرو۔ مجھے آج یہ نونل کھل کرنے ہیں۔“ وہ اسے جھاڑتی پھر

کھنے قابل پھیلا کے بیٹھ گئی۔ اسے جب ہی مقدس کو بلاؤ ڈولانا ہوتا وہ اسے ”خانم“ کہہ کے چھوڑتی۔ لیکن آج چڑنے کے بجائے وہ کھلکھلا کے ہنس پڑی تو شنابر نے مڑ کے اسے دیکھا۔

اور کچھ کہتے کہتے رہ گئی۔ رات وہ جس حالت میں کمرے میں آئی تھی وہ حالت ایسی برگز نہیں تھی کہ سنبھلنے میں اتنا کم وقت لگتے۔

لیکن اگر وہ خود کو نارمل ظاہر کرنے کے لیے اتنی فریٹس نظر آ رہی ہے تو مجھے بھی اپنے

حالت کو دیکھنا چاہیے۔ کیا پتہ میرے استفسار پہ وہ پھر سے کبھر جائے اور

میں نے اسے بتا دیا کہ اس کے دل سے ہوسوں، اندیشوں اور سوالوں سے گھرے دل کو

ناشتے کی ٹرے لے کے کچن سے نکلتے: دے اس کی نظر باچا جان کے کمرے کی طرف

انہیں اور اس کے قدم ہتھر گئے۔ ذہن پھر سے اس بند کمرے میں ہونے والی پڑھ چھ گشتگو کی طرف چلا گیا۔ اسی لیے وہ نیچے آنے سے کتر رہی تھی۔ وہ کم از کم آج کے دن پھر سے اپنے

دل و دماغ کو اس پھیلی میں نہیں الجھنا چاہتی تھی۔ وہ دل و دماغ جو خدا کے حضور اپنا مقدمہ پیش کر کے سبک سے تھی۔ اس نے بدقت قدم اٹھائے اور میزھیوں کی جانب بڑھی۔

”آپ کچھ بھی کہیں بی بی جان، باچا جان، اچھا نہیں کر رہے۔ انہیں اور کچھ نہیں تو

مٹی کا مہینہ یہاں کا سب سے خوش گوار مہینہ ہے اور اسی مہینے میں وہ جشن بہاراں منایا جاتا ہے جس کی اکثر جھلکیاں ٹی وی پروگرامز میں دکھائی جاتی ہیں۔ آگ کا بڑا سا الاؤ جس کے گرد خوشی سے دکتے چہروں کا سادہ مگر منظم رقص۔ جب فیروز نے بتایا کہ ہم لوگ بھی کل رات ہونے والے اس جشن میں مدعو ہیں تو میں بے حد پرجوش ہو گیا۔ آج صبح ہی فیروز مجھ سے اجازت لے کر ایک دن کے لیے آگے کسی قصبے میں اپنے والد کے کسی دوست کی عیادت کے لیے چلا گیا۔ مجھے اور تو کیا اعتراض ہو سکتا تھا، لیکن میں نے اسے کل تک ہر حال میں واپس لوٹنے کی تاکید کی۔ میں جشن میں اس کے بغیر شرکت نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ مجھے اس کے حوالے سے اس کے مہمان کی حیثیت سے مدعو کیا گیا تھا۔

آج کا شمارا دن میں نے بمبوریت کے اڈے نیچے راستوں پہ بھٹکتے ہوئے گزارا، ایران چاچا میرے ہمراہ تھا۔ میں نے وہاں کارواہی قبرستان بھی دیکھا۔ ایک کھلا سا میدان صبح میں ٹولی بھولی چار پائیاں، شکت اسخو اس اور پڑ پڑا ہونے تابوت بیت ناک ماحول پیدا کر رہے تھے۔ ایران چاچا ہانے لگا۔

”یوں تو ہمارے ہاں مردے کو تمام آخری رسومات ادا کرنے کے بعد چار پائی سمیت یہاں دفن دیتے ہیں، لیکن کچھ صاحب حیثیت لوگ اب تابوت بھی بنانے لگے ہیں، مردے کے ساتھ اپنی حیثیت کے مطابق خوراک بھی رکھی جاتی ہے۔ فرشتے جب مردے کے پاس آتے ہیں تو وہ ان کی تواضع کے لیے یہ خوراک پیش کرتا ہے۔“

پورے جہاں اور میدانوں کی توجہ کھسوٹ اور بربریت کی نشانیاں وہاں پھیلی ہوئی تھیں۔ میں نے جہر جہری لی اور آگے چل پڑا۔

”جاچا تم تو کہہ رہے تھے جنگل کے اندر کا حصہ بہت خطرناک ہے، ہر طرف کا زہریلا سانپ اور خونخوار جانور اندر موجود ہے، پھر یہ عورتیں پکنگ منانے وہاں کیوں جا رہی ہیں۔“ میرے سوال پہ چاچا الجھا۔

”پن، کنگ؟ وہ کیا بنا ہے؟ بچہ یہ تو ماش دیوتا کی خدمت میں کھانا پیش کرنے جا رہی ہیں۔ کل تہوار ہے نا، ہر تہوار میں دیوتا کی دعوت کے لیے کھانا جنگل میں پھینک دیا

وراب کی تم از کم یہ بات تو مان لینا چاہیے کہ وہ زریاب کے آنے تک اپنا فیصلہ ملتوی کر دیں۔ اب تو وہ آنے ہی والے ہوں گے، نطاشہ کے بابا کا تو یہی کہنا ہے۔“ چچی جان کے کمرے سے آتی تائی جان کی دہنگ مگر جھنجھلائی آواز نے اسے پھر سے رُک جانے پہ مجبور کیا۔

”اللہ کرے، ایسا ہی ہو۔ زریاب بچہ ساتھ خیریت کے اپنے گھر لوٹے اور... سب ٹھیک ہو جائے۔ انشاء اللہ سب ٹھیک ہو ہی جائے گا... سب ٹھیک جائے گا۔“ بی بی جان کی حنکرا آواز سنائی دی۔

”اللہ کرے...“ تائی جان نے تائید بھرا بہنارا لیا پھر بے لفظوں میں کہنے لگیں۔

”ویسے میں نے سنا ہے مردوں سے کہ زریاب کو یہاں آنے میں خطرہ ہی خطرہ ہے، وہ سو سال بعد بھی آئے تو فیروز خان کے لوگ اسے زندہ تو چھوڑیں گے نہیں۔“

”اللہ نہ کرے... خیر کی بات کرو میں بی بی جان... خیر نا گو خدا سے۔“ بی بی جان نے ان کے انہیں گھر کا اور وہ جو خود کو ان سب ہذا کرات سے بے نیاز خانہ نے کسی کوشش سے بڑھے آگے بڑھنے پہ آمادہ کر رہی تھی۔ فیروز خان کے چہرے تاپا پٹا لگتا تھا۔

فیروز خان... فیروز خان وردگ... یہ تو وہی بابا جان کے سوات والے دوست ہیں جن کا تذکرہ ڈائری میں ہے۔ اس نے تمام حواس بھٹ کر کے دروازے کے پیچھے سے آنے والی آوازوں کی طرف متوجہ کیے۔

”میں تو یونہی ایک بات...“ تائی جان منمنائیں۔

”پھر بھی گل بھا بھی آپ کو سوچ سمجھ کے بات کرنی چاہیے۔“ چچی جان کے لہجے میں خشکی تھی۔

بی بی جان کی وہی دہنی سسکیاں کمرے میں گونج رہی تھیں۔

URDU PHOTO

جاتا ہے۔“

”بڑے پیڑ دیوتا ہیں تمہارے۔“ میں بڑبڑایا۔
”دودھ کھو، تمہارا قبر۔“

میں ایک شفاف مجیل کے کنارے اُدنچے سے پتھر پہ بیٹھا ٹھنڈے پانی سے وضو کر رہا تھا جب چاچا کی پاٹ دار آواز پہ چکنے پتھر سے پھسلتے پھسلتے بچا۔ میں نے مڑ کے اسے دیکھا، شاید اس کے دیوتا کی شان میں گستاخی کرنے کی پاداش میں میرا قتل کا منصوبہ تیار ہو گیا ہو، لیکن اس کے تاثرات نارمل ہی تھے۔ اس کی نظروں کے تعاقب میں میں نے ذرا سا اچک کے دیکھا۔ کچھ فاصلے پر چناروں کے سائے میں ایک اکیلی قبر تھی۔ قبر کچی تھی مگر اس کے گرد پتھر لگے ہوئے تھے اور پتھریں مٹی کا سب سے بھی تھیں۔

”اوہ۔“ اب میں سمجھا۔ کسی مسلمان کی قبر تھی جیسے وہ میری قبر بنا رہا تھا۔
”تمہیں اللہ سمجھے چاچا۔“ میں نے ذرا حیرت سے اسے غور سے دیکھا اور اسے وضو کرنے کے لیے اچھوٹا سا حین وادی کے سرسبز قطعے پہ چھوڑوں اور اسے زینت کے طور پر سجھانے کے لیے کچھ عجیب سا لطف اور سکون محسوس ہوا۔ یہ سچ ہے کہ فطرت آپ کو خدا سے اور قریب کر دیتی ہے۔ چہرے کو چھو کے گزرتی بدلیاں بدن میں جھرجھری پیدا کر دیتی ہیں۔ سلام پھیرتے ہوئے میری نظر پھر اس قبر پہ پڑی نجانے میرے دل میں کیا آیا کہ چند لمحوں بعد میں اس قبر کے سر ہانے کھڑا ہوا تھا۔ بڑھ کے ایک بڑا سا گھوڑے کے منہ میں نور اور اس کی چٹائی پر اس کے سر ہانے پھیلا دیں۔ واپس پلٹتے ہوئے ایک سرشاری کی کیفیت مجھ پہ چھائی ہوئی تھی۔
۱۸ مئی ۱۹۸۰ء

مجھ سے وعدہ کرنے کے باوجود فیروز آج نہیں لوٹا۔ میں نے سنا تھا کہ فیروز نے اپنے کمرے میں یہ سنا ہے۔ اس جشن کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے اور اپنے کمرے میں یہ سنانے کے لیے میں نے اپنے کمرے میں جا کر بیٹھا تھا۔ اب فیروز غائب تھا۔ موسم کی خرابی مجھے اس کی بے بسی کا یقین دلانے لگی تھی کہ یقیناً سارا دن چلتی تیز آنندھیاں اسے سفر کرنے سے روکتی ہوں گی اور شام کے بعد تو ان علاقوں میں سفر کرنا یوں بھی ناممکن ہوتا ہے۔ پھر بھی مجھے رہ رہ کے اس پہ غصہ آ رہا تھا۔

میں اکتایا ہوا سا چارپائی پہ سیدھا لیٹا چھت کی کڑیاں گن رہا تھا۔ ساتھ ساتھ اپنی جس سہامت اور حسن شامہ سے کام لیتے ہوئے کڑھ کڑھ کر وادی میں ہونے والے جشن کی گہما گہمی محسوس کر رہا تھا۔ کھلی کھڑکی سے اُونچے اُونچے سروں میں اجنبی زبان والے گیتوں کی مدھم

مدھم آوازیں آرہی تھیں۔ الاؤ کا دھواں فضا میں پھیلا ہوا تھا۔ جلتی لکڑیوں کی کڑوی خوشبو، چاول دم لگنے کی اشبا انگیز مہک کے ساتھ ساتھ جربئی کھیلنے کی ناگوار سی بدبو بھی آرہی تھی۔ اچانک کمرے کے دروازے پہ زوردار دستک ہوئی یہ اچانک اور زوردار دستک ایران چاچا کی مخصوص تھی۔ میں نے بے دلی سے اسے اندر آنے کو کہا۔ اس کے ساتھ ساتھ چند اور مقامی لوگ بھی زور زور سے بولتے چلے آئے۔

میں پھرتی سے اُنھ بیٹھا۔ ان کے انداز سے فحشگی اور اپنائیت بیک وقت غیاں تھی۔ ایران چاچا نے انہیں خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
”صیب، یہ لوگ بہت سخت خفا ہیں۔ تم نے ان کی دعوت کو قابل توجہ نہیں سمجھا، اس لیے تم صرف فیروز خان صیب کے مہمان نہیں پوری وادی کے مہمان ہو اور وادی کا کوئی مہمان نہیں ہو سکتا۔“
”کیا ہوا تم ہم لوگ کے ساتھ چلو، اگر کوئی کسر رہ گئی تمہاری خاطر میں تو فیروز خان صیب سے کہہ کر سو جو تیاں لکوا لینا۔“

اس کے استحقاق پہ میں مسکرا دیا اور مزید نخرے نہ کرتے ہوئے ان کے ہمراہ چل پڑا۔ پوری کیا ایش عوام اس وقت ایک کھلے سے میدان میں جمع تھی۔ بچے، بوزھے، جوان سب نے اپنے ٹولے بنائے بیٹھے تھے۔ ایک طرف چند بزرگ خواتین برتن نما ساز بجا بجا کر گیت گاتیں اور الاؤ کے گرد میں بیس مردوزن کی ٹولی دائرہ بنا کے گھومتی رہی۔ کچھ کچھ دیر بعد ٹولی کے ارکان بدل جاتے تھے۔

میں نے کھانے کے بعد چہروں پہ پھیلے مسرت کے عکس دیکھے بھی رہا تھا اور اپنے کمرے میں بیٹھ کر مختلف زبانوں کے قیدیوں کو دیکھا تھا۔ میری توجہ رقص سے زیادہ ان کے چہروں پہ تھی۔ یہ سب چہرے مس کے نہیں اور کھس دیکھے تھے۔ جو دل میں وہی چہرے کے خندہ خال سے ظاہر ہوتا تھا اور اس وقت ہر چہرے پہ صرف ایک ہی چہرہ جھملا رہا تھا اور وہ تھ خوشی کا..... محبت کا..... میری خوبیت کو ایک مترنم آواز نے توڑا۔

”صیب..... میں۔“ میں نے مڑ کے دائیں جانب دیکھا۔ میرے ساتھ بیٹھے ژان خان اور اس کے ساتھیوں کو ان کے کیا ایش دوست رقص کے لیے لے جا چکے تھے اور اس وقت میرے دائیں طرف وہی عجیب سے نام والی لڑکی بیٹھی تھی جو میری مادری زبان بڑی روانی کے ساتھ بولتی تھی۔

”تم..... وہی ہونا..... مریم علی۔“ میں نے ذہن پہ زور ڈالا۔

”نہیں، مومنہ علی..... مومنہ علی ہے میرا نام۔“ وہ ذرا سا مسکرائی تو قدحاری اتار کے رنگ والے اس کے گدازلیوں سے موتی جیسے چمکیے خوب صورت دانتوں نے لٹکارا مار کے جیسے روشنی ہی میرے اطراف بھردی۔ الاؤ کی کئی فٹ اونچی ہوتی آگ کی روشنی بھی مدھم سی پڑ گئی۔ میں سکور ہو گیا، تب میں نے پہلی بار اس کا تفصیلی جائزہ لیا۔ اس کی ہلکی بھوری زلفیں وہاں کی روایتی عورتوں کی طرح مینڈھیوں کی صورت سختی اور صفائی سے گندھی تھیں، ماتھے اور زخسار پہ بھرے تل گو دے تھے۔ اس کی آنکھیں یہاں کے لوگوں جیسی سبز یا نیلی نہیں تھیں، بلکہ بھوری..... نہیں..... قرمزی یا شاید شہد..... ہاں شہد جیسا ہی رنگ تھا اور ان شہد کے قطرہوں کے گرد پھیلی وہ لالی جیسے شفت..... پتہ نہیں کب تک میں خود کو بھلائے ان آنکھوں کا رنگ دریافت کرنے کی کوشش کرتا رہتا کہ وہ پھر سے گویا ہوئی۔

”میں تمہارا شکر یہ ادا کرنا چاہتی تھی صیب بہر تم ہی تھے جس نے کل میرے ابا کی قبر پہ فاتحہ پڑھی تھی۔ میں نے دور سے دیکھ کے بھی تمہیں پہچان لیا تھا۔ میرے دور کے آنے کے باوجود تم وہاں سے جا چکے تھے۔ برسوں سے سوائے میرے اس قبر پہ کسی اور نے فاتحہ نہیں پڑھی۔ اللہ تمہیں بڑا اجر دے گا، تم نے ایک اجنبی شخص کے لیے دعا کی۔“ وہ آبدیدہ ہو گئی تو میں بے چین ہوا تھا۔ نمکین پانی کی یہ بوندیں کہیں شہد میں نہ مل جائیں۔

”وہ تمہارے والد تھے۔ میرا مطلب ہے تم تو.....“ وہ نےنگی سپیاں اور موتیوں کو بغور دیکھا۔ وہ فوراً بولی۔

”الحمد للہ میں مسلمان ہوں اور ایک مسلمان باپ کی بیٹی۔ میں نے اپنے والد کا نام دیا، تاکہ میرے نام سے کسی یہ ظاہر ہو جائے کہ میں کون ہوں۔“

”اوہ.....!“ میں نے سر ہلایا، اب اسے کیا بتانا کہ اس کا نام جاننے کے بعد بھی میں یہی سمجھتا رہا کہ کسی کم فہم نے بغیر مطلب جانے یونہی ایک خالص مسلم نام ایک کافر لڑکی کو دے رکھا ہے، بلکہ اس وقت تو مجھے اس انجانے شخص پہ غصہ بھی آیا تھا جس نے میری دانست میں یہ نام معقول حرکت کی ہوگی۔ لیکن اب یہ جان کر کہ وہ ایک مسلمان شخص کی مسلمان بیٹی ہے، مجھے ظمانیت ہی محسوس ہوئی اور وہ گھبراہٹ جو اسے اپنے قریب پا کے مجھ پہ خاری ہو گئی

تھی، ہل میں زائل ہو گئی۔

میں پھر سے جشن کی طرف متوجہ ہو گیا، اسے شاید کچھ اور بھی کہنا تھا، جب ہی بے چینی سے پہلو بدل رہی تھی۔ بار بار مجھے دیکھتی لیکن میرے اس کی طرف دوبارہ پلٹ کے نہ دیکھنے پہ چپ رہ جاتی۔ آخر میں نے دوبارہ گفتگو کا آغاز کیا۔

”تو تم رقص میں بھی اس لیے شریک نہیں ہو رہی۔ لیکن یہاں ڈان خان، اس کے علاقے کے دوسرے بہت سے لوگ تو یہ جشن پورے جوش و خروش سے منا رہے ہیں اور تم تو پھر بھی یہاں کی رہنے والی ہو، انہی لوگوں میں سے ایک ہو، وہی لباس پہنتی ہو، وہی زبان بولتی ہو، پھر اس موقع پہ سب سے الگ تھلگ کیوں ہو؟“

”نہیں سوائے مذاہب کے میں نے کبھی خود کو ان لوگوں سے الگ محسوس نہیں کیا، نہ میں نے، نہ میرے ابا نے، اصل میں میری ماں کیلاش تھی۔ اس لحاظ سے یہاں موجود بہت سے لوگوں سے میرا خون رشتہ بھی ہے۔ ایک غیر قوم، غیر مذہب کے شخص کی اولاد ہونے کے باوجود انہوں نے کبھی مجھ سے غیریت نہیں برتی بلکہ پندرہ سال پہلے مرنے والی میری ماں کے حوالے سے آج بھی مجھے اپنا عزیز جانتے ہیں تو میں اپنی ماں کے حوالے سے انہیں اپنا کھانا نہ سمجھوں۔ ابا نے بھی تو یہی کہا تھا۔ میری ماں کے عشق نے انہیں ہر اس چیز سے عشق کر کے مجبور کر دیا جو میری ماں سے متعلق تھا۔ یہاں کے لوگ، یہاں کی زبان، یہاں کے رقص، یہاں کے پہاڑ، ندی، نالے، یہاں کا چہرہ چہرہ انہیں عزیز تھا جہاں جہاں میری ماں سے کچھ تعلق تھا۔ اس کی آواز بھرا گئی۔

”وہ بڑے اہتمام سے اس رقص میں شامل ہوتے تھے۔ مجھے اپنے ابا کا ماں کے ساتھ کھانا کھانے میں آخری رقص آج تک یاد ہے۔ تب میں پانچ چھ برس کی تھی۔ یہی مقام تھا، یہی رقص تھا، یہی فضاؤں میں گونج رہے تھے۔ اتنی ہی روشن آگ کی ایسا ہی ستاروں بھرا آسمان تھا۔“ وہ کسی طلسم کے سے عالم میں الاؤ پہ نگاہیں جمائے ساکت بیٹھی تھی، صرف اس کے لب تا محسوس ہی حرکت کر رہے تھے نہایت مدھم آواز میں کہے گئے اس کے الفاظ مجھے جکڑ رہے تھے۔

”میری ماں کا پورا وجود دک رہا تھا، ابا کی نگاہیں اس کے چہرے سے ہٹ نہ رہی تھیں۔ ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے وہ دائرے میں رقص کر رہے تھے۔ میں یہاں اپنی تانی کی گود میں بیٹھی انہیں دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہی تھی، اچانک ابا کا ایک قدم ذرا آگے بڑ گیا۔ سنہلے

سنہیلتے بھی اس کا ہاتھ ماں کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور۔۔۔ اور ماں۔۔۔ وہ بت بنی کھڑی رہ گئی۔ سب لوگ حیرت کے عالم میں اسے دیکھنے لگے۔ کچھ شاید بات سمجھ گئے تھے اور کچھ سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اچانک میری ماں نے۔۔۔۔۔“

اس کے چہرے پہ آتے زلزلے کے آثار مجھے مکمل طور پر ارد گرد کے ماحول سے بے خبر کر کے اس کی یادوں کے ساتھ ساتھ بننے پہ مجبور کر گئے۔ وہ مجھ سے تو کیا خود سے بھی بے خبر تھی۔

”وہ چیخنی۔۔۔ چیخنی چلی گئی۔ میری نانی مجھے گود سے اتار کے روتی بیٹھتی اس کی طرف لپکی، میرا ابا ہٹکا بٹکا اس کی حالت دیکھتا رہا، پھر سب لوگوں کے ساتھ اسے سنبھالنے کی کوشش کرنے لگا، لیکن وہ چیخنی رہی، اپنے بال نوچتی، اپنا سینہ بونٹتی رہی۔ پھر اس نے اپنا آہٹ سے بے سے چھڑایا اور بھاگ گئی۔ ابا چیخے چیخے بھاگا، بھانگتا آیا۔۔۔ سب کے دیکھتے دیکھتے اس نے نیچے دریا میں چھانگ لگا دی۔“

پھر۔۔۔ پھر سب نے بہت ڈھونڈا مگر اسی کا کچھ پانا نہ چلا، اس کے لباس کی ایک دھجی تک کسی کے ہاتھ نہ گئی۔ اس رات دریا کو بھی جلال آیا، اتنی تیز لہریں اتنی خوفناک موجیں۔۔۔۔۔ نجانے کہاں بہا لے گئیں اسے۔۔۔۔۔ آنسو اس کے گالوں پہ پھیلے تو وہ ہوش میں آگئی۔ دونوں ہتھیلیوں سے آنسو پونچھ کر وہ بہتا چلا، پچھلیاں روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں بھی دل پہ ایک انجان عورت کی اچانک اور عجیب سی موت کا دکھ لیے خاموش بیٹھا رہ گیا۔

”لیکن اسے ہوا کیا تھا؟ کیا پہلے بھی کبھی اسے یہ پائلن بن کے دور سے بڑے بچے تھے؟“ میرے سوال پہ وہ افسردگی سے مسکرائی۔

”پائلن پن۔۔۔ ہاں وہ پائلن ہی تو تھی۔ کسی بہت اپنے کے اچانک پھٹ جانے کا خوف شاید یونہی پاگل کر دیتا ہے۔ دراصل میری ماں نے شادی سے پہلے اسلام قبول کر لیا تھا، وہ ایک اچھی مسلمان عورت بننے کی پوری دیانتداری سے کوشش کرتی رہی، لیکن اس کے خون کی تاثیر، مٹی کی محبت اسے اس سرزمین سے دور نہ جانے پہ مجبور کرتی رہی، اس نے شادی سے پہلے یہی شرط رکھی تھی ابا کے سامنے کہ وہ کبھی یہ داوی اور اپنے لوگ نہیں چھوڑے گی۔ اپنا پیدائشی مذہب چھوڑ دینے کے باوجود وہ اتنی جلدی یہاں کے رسم و رواج اور عقیدوں کو فراموش نہیں کر سکی جو اس کی گھٹی میں پڑے تھے۔ اپنی ماں اور نانی کی طرح وہ بھی اپنا اور ابا کا

کھانے کا پیالہ الگ رکھتی تھی کہ مرد کا پیالہ جھوٹا کرنے والی عورت جلد بیوہ ہو جاتی ہے، یہ اس نے سن رکھا تھا اور یہ بھی کہ تہوار کے رقص پہ ہاتھ چھوٹ جانا بہت بڑی بد شگون ہے اور جس کا ہاتھ اپنے سانگی سے چھوٹ جائے وہ اسی ماہ مر جاتا ہے۔ یہ خوف میری ماں کو لے ڈوبا۔ وہ اپنی آنکھوں کے سامنے ابا کو۔۔۔۔۔ شاید اسی لیے اس نے خود کو دریا کی لہروں کے سپرد کر دیا۔ تب سے میرے ابا نے رقص کرنا چھوڑ دیا۔ لیکن وہ اس جشن میں شریک ضرور ہوتا رہا۔

جن لوگوں نے کڑے وقت میں ان کا دکھ بانٹا، ان کی خوشیوں میں شریک نہ ہونا تو کم نظر ہی ہوتی ہے اس لیے ابا کے بعد میں بھی اس جشن میں باقاعدگی سے شام ہوتی ہوں، لیکن اس بار لے لے میں بتاں ہوتے کی بہت نہیں ہوتی۔ وہم گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹے ٹھوڑی گود میں لٹکائے پوٹھی رہی۔ نگ ہی نہ رہا تھا کہ کچھ منٹ پہلے ہم دونوں ایک دوسرے سے ہاتھ اچھنی کر کے بیکسر ناواقف سے ہٹا کر مل گئے۔

”ستو، تم کیا ہرا جنسی سے یونہی حل مل جاتی ہو۔“ بات تو نکل ہی چکی تھی منہ سے اب چھپتانے کے سوا کیا ہو سکتا تھا، لہذا اس میں بھی اس وقت کا خیال سے سرخ ہوتا چہرہ دیکھ کے خود کو اس قدر ناہتول سوال پہ کوس رہا تھا۔ وہ کپالتی ہی ہو گئی میں اسے روکنا چاہتا تھا لیکن وہ خود ہی ایک قدم آگے بڑھا کے پات

چھنی تھے لیکن میرے باپ کی قبر پہ وہ پھول چڑھا کے اور دعا پڑھ کے تم مجھے اپنے لیے سے لے کے شام تو صرف یہاں تہوارا شکر یہ ادا کرنے آئی تھی۔ مجھے تو خود اپنے لیے اس کے لیے میں اتنا دریا بہتے کرتی رہی، مجھے معاف کرنا صیب اگر میری کوئی بات بری لگی ہو تو وہاں میں ہرا جنسی سے تو کیا، کسی بھی جنسی سے باتیں نہیں کرتی، اگر وہ جنسی ہو تو

وہ چلی گئی اور میں اس کے آخری الفاظ پہ غور کرتا رہ گیا، ماحول کی ساری رنگینی، رقص و سرور کی گہما گہمی اب افسردگی کی کہر میں لپٹ چکی تھی۔ اس کا بھیجا لہجہ میرے اعصاب بھگور رہا تھا، اس کی کپکپاتی آواز میرا دل لرز رہی تھی اور اس کی درد میں ڈوبی آنکھیں میری روح کے اندر تک شگاف ڈال کے مجھے یہ باور کر رہی تھیں کہ کسی جنسی کا دکھ، اپنا دکھ نہیں بن جاتا۔۔۔۔۔ اگر وہ واقعی جنسی ہو تو۔۔۔

URDU PHOTO

آج صبح ہی فیروز کی واپسی ہوئی، میرے کچھ کہنے سے قبل ہی وہ معذرتیں پیش کرنے لگا۔ وجہ وہی تھی یعنی موسم کی خرابی۔

”تم نے جشن تو انجوائے کیا ہوگا؟“ اس کے سوال پہ میں چپ کر گیا۔ کیا کہتا، میں اپنی فیلنگز کسی کے ساتھ بھی شیئر کرنے میں بڑا کنبوس واقع ہوا ہوں یا یوں کہتا چاہیے قطعی نابلد ہوں! اس معاملے میں۔ سوائے تمہارے اے میری ڈائری، کوئی نہیں جس سے میں اپنے احساسات و جذبات بیان کر سکوں، لیکن کل رات کے بعد سے جو میں محسوس کر رہا ہوں وہ ابھی میرے قلم کی گرفت میں کیا آئے گا، اس جذبے کو ابھی تک میرا دل بھی صحیح طریقے سے پرکھ نہیں سکا۔ کبھی میں خود کو بے حد افسردہ محسوس کرتا ہوں، اداس، قنوطی، کبھی کبھی مجھے ایسا لگتا ہے جیسے خزانوں کے منہ کھل گئے ہوں، میرے لیے اور تمہاری محسوسی میں خوشیاں بھر پور کے تھک رہا ہوں۔ کبھی کبھی مجھے اپنا آپ ایک دم تنہا نظر سنا لگتا ہے۔ چہرہ نا آشنا محسوس ہوتا ہے اور کبھی ایسا لگتا ہے جیسے اجنبی دیکھ میں کسی بہت سے پہلے کر مٹ گئی تھی میرا ہاتھ تمام لیا ہو۔ پتہ نہیں یہ سب کیا ہے۔

میں آج سارا دن کمرے سے نہیں نکلا۔ میرے میزبان اسے رت جگے کی تحسین سمجھتے رہے، حالانکہ وہ کیا جانیں تحسین سے تو مجھے جیسے آوارہ گرد کا کبھی واسطہ ہی نہیں پڑا۔ فیروز کبھی رہا ہے میں اس کی وجہ سے باہر نہیں نکل رہا اور ایک بہت کچھ کہتا ہوں نے مجھے چونکا ہی رہا۔

”یار از ریاب جا دلالہ کہیں گھوم پھر آؤ، پھر نہ کہتا فیروز نے اپنے گھسنے سے لگا کے بٹھا دیا تھا۔ کون جانے دوبارہ تم یہاں کبھی آ پاؤ یا نہیں۔“

”دوبارہ..... ہاں مجھے واپس بھی تو جانا ہے.....“

یہ الفاظ پہ..... آ کے واپس جانا تو ایک حقیقت ہے اس وقت کو یہی فراموش کر میں اور اس کے لیے..... میری خاموشی محسوس کر کے وہ بولا۔

”یار تم تو بخارے چھڑے ہو، میں ٹھہرا زمیندار قسم کا بندہ اور وہ بھی ایک عدد پنہانی کا شوہر..... اگر تم دو دن اور ٹھہرنا چاہتے ہو تو میں اپنا پروگرام آگے کر لیتا ہوں اور اگر زیادہ دن رکنے کا ارادہ ہے تو یار پھر مجھے فی الحال اجازت دو، چند انتہائی ضروری نوعیت کے کام وہاں رکنے پڑے ہیں۔ ہفتہ دو ہفتہ بعد پھر آ جاؤں گا۔ میرے لیے پہاڑوں کا یہ سفر کوئی نئی بات نہیں۔ تم کہاں آئے دن یہ تکلیفیں اٹھاتے پھرو گے۔ اچھی بات ہے کچھ دن اور رہ لو، اگر دل

لگ گیا ہے تو.....“

وہ تو سو گیا، لیکن میرے لیے پھر سے کئی سوال چھوڑ گیا۔ میں الجھنے لگا کہ واپس جانے کی بات سن کر میرا دل رکا تو کیوں رکا؟

ٹھہرنے کا سن کر میرے اندر اطمینان نے ڈیرے ڈالے تو کیوں؟
وہ کیا ہے جو ان وادیوں میں میں تاشا چاہتا ہوں؟ وہ کون ہے جس کی کشش مجھے اس زمین سے قدم آگے نہیں بڑھانے دیتی؟
میں نے آنکھیں موندیں تو شہد کے دو چشمے جھر جھر کرتے ہوئے بنے لگے، میں نے آنکھیں کھول لیں۔

جواب مل چکا تھا۔

ایسا جواب جو اپنے بنام میں بہت سے سوال لیے ہوئے تھا۔

۲۰ مئی ۱۹۸۰ء

دو بائس تکت میں اور ڈرائنگ فیروز کے ساتھ گئے۔ اس نے میرے بارے میں اسے اتنی تاکیدیں کیں کہ مجھے ہنسی آنے لگی۔ اسے دین میں سوار کر کے میں نے ڈرائنگ خان کو بھند اصرار اس کے کام پہ بھیجا، ورنہ تو وہ فیروز کی تازہ ترین ہدایات کے زیر اثر مجھے ایک بل کو جدا کر کے تیار نہ تھا۔ وہاں سے میرے قدم خود بخود اس طرف اٹھ گئے۔

میں دیر بعد میں نے خود کو محمد علی نامی شخص کی قبر پہ موجود پایا۔ نجانی کون شخص تھا یہ اور کتنی اور عشق تھا اس کا جس کے کھونے کے ڈرنے ایک عورت کے حواس پل بھر میں

میں نے ایک ساعت میں دیوانگی کی سرحد پہ لاکھڑا کیا اور وہ عورت کتنی دلکش تھی اس کی صورت میں اس نے ایک شخص کو اپنا خاندان، رشتے تاتے، ذات پات، ہمارے سب بھلائے اس حسین پسماندہ ہی وادی میں کافر قوم کے ساتھ غربت میں زندگی گزارنے پہ مجبور کر دیا۔ میری مجویت ٹوٹی، جب میرے عقب سے دو ہاتھ طلوع ہوئے اور قبر پہ گلاب کے پھولوں کی بارش برسا گئی۔ میں نے پلٹ کے دیکھا۔ حد درجہ سنجیدگی لیے وہ مومنہ تھی۔ میں ذرا سا مسکرایا، لیکن وہ مجھے دیکھے بغیر قبر کے قریب بیٹھ گئی اور زیر لب آیات کا ورد کرنے لگی۔ یقیناً اس کے گریز کا سبب میرا وہ دل آزار جملہ تھا۔ مجھے نئے سرے سے خود پہ غصہ آنے لگا۔ میں کاشن کی آرام دہ ٹراؤزر ذرا سا اوپر کھینچ کے اس کے نزدیک دوڑا نو بیٹھ گیا۔

اس نے پڑھنے کے بعد دعا کے لیے ہاتھ بلند کیے اور بلند لرزیدہ دراز پلکوں کے ساتھ وہ مجھے اتنی مقدس، اتنی نورانی لگی کہ مجھے اپنا اس کے اس قدر نزدیک بینہنا گستاخی محسوس ہوا، میں ذرا سا کھسکا۔ چہرے پہ ہاتھ پھیر کے اس نے ایک نظر میرے پیچھے ہونے پر ڈالی اور کہے بغیر نہ رہ سکی۔

”اچھا: ہوا صیب تم خود ہی پرے ہو گئے ورنہ پھر کہتے پھرتے، کیا میں ہر جنسی کو اتنا ہی قریب بیٹھنے دیتی ہوں۔“

”لا حول ولا قوہ“ اس کی جلی کئی بات پہ مجھے تازہ آ گیا۔

”سو منہ مجھے گھما پھر کے بات کرنا نہیں آتی، بلکہ یوں کہو آتی ہی نہیں۔ میں یہ نہیں کہوں گا کہ اس وقت میری بات کا یہ مطلب نہیں وہ تھا دراصل تم اتنی او اس تھیں اور رو رہی تھیں، مجھے کسی لڑکی کو چپ کرانا نہیں آتا اور نہ ہی پہلی دیکھنے میں نے اس وقت صرف یہ سمجھا تھا کہ کوئی ایسی بات کروں جس کا تعلق اس جیسے واقعے سے ہو تا کہ تمہیں اس کی کیفیت سے نکال سکوں۔ ہاں میں یہ اعتراف کرتا ہوں کہ جنہوں میں انتہائی نفیس بات منہ سے نکل گئی۔ تمہیں برا لگنا ہی چاہیے تھا لیکن اگر میں یہ سچا مانگتا تو کیا تم اپنا دل میری طرف سے صاف کر لو گی؟“

وہ کوئی جواب دیئے بغیر قبر کی گرد سے سوکھے پتے اور شبنمیاں اٹھانے لگی۔ مجھے لگا جیسے وہ کوئی جواب دیئے بغیر لوٹ جائے گی لیکن جاتے جاتے وہ پھر سے ایک عجیب سی بات کہہ گئی۔

”مجھے صرف یہ برا لگا صیب کہ تم نے خود کو اجنبی کہا۔“ اس کا یہ سادہ سا جملہ مجھے من کر گیا اور پھر سے سوالوں کے جنگل میں بھٹکنے کو چھوڑ گیا۔ آج پھر طویل تاریک رات ہو گئی، چیتنے چتکھماز تے سوال ہوں گے اور جواب میں میرے دل سے نکلتے سوالوں کی آوازیں سنائی دے رہی ہیں۔ اُف..... میں کیوں رُکا..... کیوں نہ آج ہی لوٹ گیا، یہ روز کے ساتھ بٹھے بیڑیاں پسند نہیں۔ الجھاتے سوالوں سے نفرت ہے مجھے..... ایک جگہ ٹھہرنے سے میرا دم گھٹنے لگتا ہے۔ پھر میں کیوں رُکا..... کیوں آج رات مجھے اس کا جواب ڈھونڈنا ہے۔ ورنہ واپس لوٹ جانا ہے۔

۲۱ مئی ۱۹۸۰ء

اور میں واپس نہیں آؤں۔

مجھے اوشنا بھی نہیں تھا۔ کم از کم اسی نے تو نہیں۔ اس طرح خالی ہاتھ تو نہیں، کبھی کبھی خود سے ہار مان لینا بھی کتنا اچھا لگتا ہے۔ رات بھی یہی ہوا تھا۔ اپنے ذہن و شعور کے تمام دلائل، جواز اور حیلے بہانوں کے پر نچے اڑتے دیکھے تھے میں نے، صرف دل کی ایک ذرا سی ضد پہ..... جو ہمک ہمک کے بس یہی کہتا جا رہا ہے۔ صرف وہ..... بس وہ..... اور کوئی نہیں اور کچھ نہیں..... صرف وہ.....

۲۲ مئی ۱۹۸۰ء

کل کا سارا دن میں اُسے واہی کے مختلف حصوں میں تلاشتا رہا، لیکن وہ مجھے نہ ملی اور آج میں نے اسے جھیل سبک کے پاس پایا۔ وہ خوبانیاں ٹھنڈے پانی سے دھو دھو کے نوکری میں برکتی جا رہی تھی۔ مجھے دیکھ کے اس کا ذرا سا مسکراتا مجھے حوصلہ دلا گیا کہ اس دن: وہ نے واہی تلخی کا اثر اس کے دل سے زائل ہو چکا تھا۔

”کہاں تھیں تم؟ مومن میں کل سارا دن تمہیں ڈھونڈتا ہی رہا۔“

میں لہجے کی بے چینی پہچاننے میں قطعاً ناکام رہا تھا اور یوں بھی میں اب اس سے کچھ چھپاتا ہی کب چاہتا تھا۔

”کوئی کام تھا صیب؟“ وہ بدستور اپنے کام میں مشغول تھی۔

”مجھے بھلا کیا کام ہو سکتا ہے، تم سے اور یہ تم مجھے صاحب صاحب کیوں پکارتی ہو، یاب خنک ہے میرا نام۔“

میرا نام ہے۔“ وہ منہ پہ زور زور سے چھپا کے مارنے کے بعد اس بڑے سے پتھر سے ایک سنگ پھینکا، جس پہ میں ٹانگیں پھارے بیٹھا تھا۔ میں نے ایک نظر بھر کے اس کے چہرے کو دیکھا، پتھر پانی کے قطرے کود دیکھا۔

”تم نے بتایا نہیں کل سارا دن کہاں غائب رہیں تم۔ پوری بستی میں ہر جگہ کہیں بھی نظر نہیں آئیں۔“ اس نے میری بے تابی اور لہجے کی تڑپ کو حیرت سے محسوس کیا۔

”میں..... میں.....“ بٹائیسی، گئی تھی۔ میرے ماموں کی بیٹی ہے وہاں، اس کی خیر خبر کے لیے کل میں سارا دن وہاں رُکی تھی۔ آج میری خالہ وہاں گئی ہے اور میں ان دونوں کے لیے یہ پھل، انڈے اور تخنی لے کے جا رہی ہوں۔“ اس نے نوکری کی طرف اشارہ کیا، جس میں اس کا ایک سیاہ جوڑا بھی رکھا تھا۔

”کیا تم اور کچھ دن وہاں رکو گی۔“ میرا دل تنگ پڑنے لگا۔



URDU PHOTO

”نہیں تو..... بس یہ دے کے آ جاؤں گی۔“

”تو یہ کپڑے، میں سمجھا وہاں رہنے جا رہی ہوں۔“

اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور چپ چاپ نوکرا کر پہنکائے کھڑی ہو گئی۔

”میں بھی چلوں تمہارے ساتھ، یہ سامان اٹھالیتا ہوں۔“ میرے ہاتھ آگے

بڑھانے یہ وہ گھبرائی۔

”نہیں، نہیں..... تم کیسے جاؤ گے، تم نہیں جاسکتے، وہاں یہ کوئی.....“

”بہت دور ہے کیا، یہ بٹالینی گاؤں“ اس نے بے ساختہ مسکراہٹ روکی۔

”بٹالینی۔“ گاؤں نہیں ہے وہ سامنے جو جمیل کے اس طرف گارے کا بڑا سا مکان

نظر آ رہا ہے نا اسے بٹالینی کہتے ہیں اور اب خدا کے لیے مجھے جانے دو۔“

وہ زچ سی ہو گئی، اس کے چہرے پہ پھینکی گئی لطف لے رہی تھی، پھر بھی

نے اس کی حالت یہ مزید ستم نہ ڈھاتے ہوئے راستہ چھوڑ دیا۔

”اچھا جاؤ، لیکن میں کل اسی وقت اسی جگہ تمہارا انتظار کروں گا۔“ اور مجھے

بتانا کہ تمہارے ماموں کی بیٹی کو لڑکا ہوا یا لڑکی۔“

وہ جاتے جاتے چونک کے پٹی اور میرے شرارت بھرے چہرے پہ ایک خفگی بھری

نظر ڈال کے تیز تیز قدم اٹھانے لگی۔ اس کی حیا اور جھجک نے میرا دل موہ لیا۔ باپ کے

مسلمان خون کی تاثیر اس کی رگوں میں دوڑ رہی تھی جس سے یہاں کی دیگر

دو شیرازوں کی طرح بے باک نہیں ہونے دیا اور ایک عام سی بات کہنے میں اس کا

تذبذب مجھے اتنا اچھا لگا کہ میں بٹالینی کے بارے میں سب کچھ جاننے کے باوجود اس

کے سامنے انجان بنا رہا۔

فیروز کے ساتھ پہلے دن کی سیاحت کے دوران میں اس کے پاس پہنچ گیا۔ آج

کنارے کے بالکل سامنے موجود بغیر کسی کھڑکی اور روشن دان کے پتلی چھت والے اس

کچے مکان کو دیکھ کر میں نے ایران چاچا سے استفسار کیا تھا کہ یہ مکان آبادی سے اتنا الگ

تھلک کیوں ہے۔

یہ ”بٹالینی“ ہے۔ ہمارے ہاں جب کسی عورت کو بچہ ہونے والا ہو تو وہ یہاں قیام

کرتی ہے، اپنے مرد اور اہل خانہ سے کٹ کر، ناپاکی والی عورت کو آبادی میں قدم رکھنے کی

اجازت نہیں۔ یہاں صرف اس کی دائی رہ سکتی ہے اس کے ساتھ، یا پھر گھر کی عورت ملنے آ

سکتی ہے۔ لیکن اسے بھی رات رات زکے کی اجازت نہیں۔ بلکہ وہ اپنے ساتھ ایک صاف لباس

لائی ہے جو بٹالینی کی حدود سے باہر رکھا جاتا ہے۔ زچہ سے ملنے کے بعد وہ جمیل کے پانی

سے غسل کر کے اپنا پہنا ہوا لباس دھوتی ہے، اور صاف لباس پہننے کے بعد بستی میں قدم

رکھتی ہے۔ مردوں کا اس عمارت کے قریب جانا منع ہے۔“

ایران چاچا کے تفصیل سے بیان کرنے پہ فیروز نے ریما رکس دیا تھا۔

”تو عورتوں کا کیونٹی سینئر ہے یہاں۔“

۲۳ مئی ۱۹۸۰ء

مجھے اس سے تقریباً دس بجے ملنا تھا، لیکن فجر کی اذان سے بھی کچھ پہلے مجھ پہ بے

چینی چھائی اور ناستے کے بعد تو مجھ سے ایک پل بھی نہڑکا گیا اور میں جمیل سہوک کی طرف

نکل پڑا۔ وہاں پہنچنے کے پہری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے اس سرسئی چکنے پتھر پہ

مومنہ کو بیٹھے دیکھا۔

”تم کب آئیں؟“

”بس ابھی.....“ وہ بھی شاید اپنی جلد بازی پہ نخل سی تھی۔

”پھر..... کیا خبر ہے؟“ میں نے اسے چھیڑا۔

”بیٹا ہوا ہے۔“ اس نے خوش سے پور لہجے میں بتایا۔

”چھ بیٹیوں کے بعد۔“

”ارک ہو۔“ میں اس کی ہر خلوص اور بے پایاں محبت سے متاثر سا ہو گیا جو اس

کے دل میں خود سے طلستہ ہر شخص کے لیے تھی۔

”اور پہلے میں نے اس کا نام بھی رکھ دیا ہے۔“ ”زریاب خان۔“ اس نے جھکتے

ہوائے بتایا۔ اس کی زبان سے پہلی بار اپنا نام سن کر میں سحرزدہ ہو گیا۔ مجھے ایسا لگا جیسے اس

نے میرا نام نہیں بلکہ میرے نام پہ پھول ہی پھول چن دیئے ہوں۔ میری خاموشی محسوس

کر کے وہ انک انک کے بولی۔

”کیا ہوا صیب..... برا لگا تمہیں..... تمہارا نام میں نے ایک.... میرا مطلب ہے

کہاں تم کہاں وہ..... شاید میں نے غلط کیا ناں۔“

”بالکل غلط کیا..... مجھے دوبارہ صاحب پکار کے تم نے بالکل غلط کیا۔ میں نے کل

جی تمہیں منع کیا تھا کہ اب مجھے صاحب مت پکارنا۔ سخت برا لگتا ہے مجھے۔“



”اس میں بُرائی کی کیا بات ہے۔ یہ کوئی خراب لفظ ہے کیا میں تو تمہیں عزت دینے کے لیے صیب کہتی ہوں۔“

”مجھے تم سے احترام نہیں... محبت چاہیے۔“ میری اس بات پہ اس کا رد عمل وہی تھا جو ہونا چاہیے تھا۔ وہ حسین تھی... یہ تو میں جانتا تھا، مگر اس موقع پہ چہرے پہ سجانے کے لیے اتنے رنگ اس نے کہاں چھپا کے رکھے تھے اس کا اندازہ میں نہیں کر سکتا تھا۔ وہ کچھ نہ بولی مگر اس کے نیم وا کپکپاتے لبوں سے سانسوں کی مدہم آوازیں انوکھے اقرار کر رہی تھیں۔ شہد لٹاتی جھکی آنکھیں ایک ہی بار حیرانی سے مجھ پہ اٹھی تھیں پر جھکنے سے پہلے خاموشی سے ایک عہد کر گئی تھیں۔

۲۴ مئی ۱۹۸۰ء

آج مومنہ کا ایک اور وصف کھلا مجھ پہ۔ وہ اچھا ہنستا ہوا ہے یہ تو میں پہلی ملاقات میں ہی جان گیا تھا۔ آج میرے بار بار اس کے ہنسنے پر بھی ہنسنے لگتی تھی۔

”میں نے سنا ہے یہاں کے لوگ خاصے شاعر اور شاعرین ہیں۔ تم پر تو ذرا اثر نہیں دیکھتا ہے ان فنکاروں کی رنگینی کا۔“ میں نے جھوٹ موٹ منہ ہنھلایا۔

”اچھا میں تمہیں۔“ ”برہ“ سنا ہی ہوں، مگر تم میری طرف دیکھنا مت، بالکل بھی نہیں ورنہ میں گانے نہیں پھاؤں گی۔“ وہ بار بار مان کے بولی۔

”کیوں... یہ کیسی پابندی ہے، میں کیوں نہ تمہیں دیکھوں... ایسا ہی مشکل لگتا ہے، تمہیں میرے سامنے گیت گانا تو تم اپنی آنکھیں بند کر لو۔“

میں ایک پل کے لیے بھی اس سے رنکے چہرے کی چاہتا تھا۔ اس نے شہد کی جھیلوں پہ گلابی پونوں کے پادل گرایے۔ جتنے سرواں اور گادوں لے میں اجنبی الفاظ کا جادو میرے ارد گرد پھیلنے لگا۔ اس کے پونوں اور شفاف گردن پہ بیک وقت بلکی نیلی ریس اُبھر اور ڈوب رہی تھی، زخساروں پہ ہلکورے لیے بھنوروں میں، میں ایسا کھویا کہ وہ کب خاموش ہوئی پہ نہ ہی نہ چلا۔

”کیسا گانہ؟“ وہ اشتیاق سے پوچھنے لگی میں کچھ بھی نہ کہہ سکا وہ مزید بتانے لگی۔

”برہ“ یہاں کا لوک گیت ہے، جس میں ایک لڑکی اپنے ایسے محبوب کے لیے بچہ انتظار ہے جو سفر میں ہے۔ وہ اس کی جدائی میں اپنی حالت بیان کرنے کے ساتھ ساتھ سفر

میں اٹھائی جانے والی اس کی صعوبتوں پہ بھی فکر مند ہے۔

اے میرے محبوب
میں ہر روز تمہارے لیے اپنے بالوں کے کنڈل بنا کے رکھتی ہوں۔
میری آنکھیں تمہاری راہ دیکھ رہی ہیں
تم نے چھ ماہ دکھا اٹھایا ہے
اے میرے محبوب
اوٹ آؤ

میں تمہاری ناگہوں کی تھکن، اپنے ہاتھوں میں سمو لوں

اس نے بڑی خوب صورتی سے گیت گانا جو آج سناؤ میں دہرایا۔ تو مجھے ایک خیال آیا۔

”کشتیوں، تم کچھ لکھنا پڑھنا جانتی ہو؟“

”تمہارا بہت بڑا جتنا پڑھا ہے۔ یہاں کتابیں عام نہیں ملتیں اس لیے باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی، میرا ابا بھی کوئی عالم فاضل تو نہیں تھا، بس پڑھنا اور لکھنا سکھا دیا۔ نماز، کلمے بھی یاد کرادیے۔ ماں کے بعد ابا بہت بکھر گیا تھا۔ شادی کے پانچ چھ سال بعد تک بھی دادی کے اکثر لوگوں نے اسے دل سے قبول نہیں کیا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ ابا، ماں کا اختیار کر کے ہم لوگوں میں مل جائے لیکن اس کے برعکس ماں نے اس کے رنگ میں سب سمجھا، یہ بات بہت سے لوگوں کو ہضم نہ ہوئی انہوں نے اس پہ اسی دادی میں سب سمجھا اور ان کی توقع کے برعکس اس نے یہ بات مان لی۔ اس لیے وہ مجبوراً

ماں کے بعد اچھا پڑھا لکھا لے کے یہاں سے جاسکتا تھا۔ اپنے شہر یا کہیں اور بھی، اس کے ماں باپ زندہ نہ تھے، مگر بہن بھائی ذات برادری سب تھا۔ وہ کہیں جا کے نئے برے سے زندگی بسر کر سکتا تھا، لیکن وہ نہیں گیا، اس دادی کو چھوڑ کے نہیں گیا، جو اس کے عشق کی گواہ تھی جو اس کی محبت کی مہربان گود تھی۔

یہاں اپنی جگہ مضبوط کرنے کے لیے، ان لوگوں کو اپنانے کے لیے اس نے کیا نہیں کیا۔ یہ چند ایک ذرا پڑھے لکھے نوجوان نظر آ رہے ہیں۔ یہ ابا ہی کی بدولت ہیں۔ یہاں کے کاشت کاروں کو منڈی میں صحیح بھاؤ لگوانا بھی ابا نے سکھا پایا۔ بہت سی عورتیں اپنے شیر خوار بچے لیے اس کے پاس آتیں کہ وہ تھبے جا کر اسپرین، کھانسی کے شربت اور درود وغیرہ



URDU PHOTO

زندگی اتنی خوب صورت ہو جائے گی یہ کبھی سوچا ہی نہ تھا۔ دن اتنے مہکنے لگیں گے، خبر ہی نہ تھی۔ پہروں اس کے ساتھ پتا کے بھی بچھڑتے وقت اداسی دل پہ پنجے گاڑ لیتی ہے۔ گھنٹوں اس کے ساتھ ادھر ادھر کی ہزار باتیں کرنے کے بعد بھی واپس آ کے لگتا اس سے وہ سب تو کہا ہی نہیں جو پچھلی شب سوچ کے رکھا تھا اور تو اور برسوں بعد ایسا ہوا ہے۔ میں نے کئی راتیں ڈائری نہ لکھی۔ اپنا دل میں کھولتا ہی ڈائری کے ذریعے تھا اور اب جب دل کو اک نیار نیت مل گیا ہے تو.....

وہ بولتی بھی تو اتنا اچھا ہے کہ گھنٹوں سنتے رہنے سے بھی تھکتا نہیں ہوں۔ وہ خود بھی جب تھک جائے تو چپ کر جاتی ہے اور تب میں اسے کچھ نہ کچھ کہہ کر چھیڑتا ہوں۔ غصہ بھی تو اسے اس دور جلد آتا ہے تب وہ پھر سے بولنا شروع کر دیتی ہے۔ میرا دل کرتا ہے وہ بولتی رہے، پتلی پتلا رہوں چاہے وہ غصے میں ہی کیوں نہ کچھ کہہ رہی ہو۔ ابھی کل ہی وہ میری معلومات میں آئے تھے کہ لیے وادی کے مختلف رسم و رواج اور عقیدے بتا رہی تھی۔

”یہاں کے لوگ نہایت کمزور عقیدہ رکھتے ہیں۔ کچھ تو تدریس سے بے بہرہ رہنے کی بدولت بھی ہے۔ بہر حال یہ بھی ہے اپنے عقائد پہ یہ سختی سے عمل کرتے ہیں۔ ”اگر“ یعنی چھ دن ہتھوس ہوتا ہے اس دن کوئی کام نہیں کیا جاسکتا، البتہ تقریبات وغیرہ منعقد کر کے لینے والے دن مناسبت ہوتا ہے۔ اسی طرح 20 کا ہندسہ اور مارچ، اپریل مئی کے مہینے مقدس کہلاتے ہیں۔ بیاز کو یہ لوگ جنت کا مبارک پھل سمجھتے ہیں۔ عورتوں کے لیے سیاہ رنگ مخصوص ہے، بچوں کو بال کٹوانا اور سر ننگا رکھنا منع ہے۔ مرغ حرام ہے۔ اسی طرح اپنا پالا جانور خود کھانا بھی حرام ہے۔ عورت پر زمویشی کا گوشت کھانا حرام ہے وغیرہ

یہ ساری آفت اور نظام کے بارے میں ان کا اپنا نظریہ ہے جیسے بجلی چکنے کا مطلب ہے برائی لڑائی کے دوران کوار چار ہی ہیں۔ اور جب گھوڑا اور گائے آسمان پہ دوڑ لگاتے ہیں تو آندھی آ جاتی ہے۔ پیاروں پہ پریاں رہتی ہیں، جن کی خدمت میں نذر چڑھانا ہر شخص پر فرض ہے جو کوتاہی کرے، پریاں اس کی زندگی پہ اچھا اثر ڈال سکتی ہیں۔“

وہ چپ ہوئی جیسے میری غم دلچسپی کو محسوس کر لیا ہو۔ میں دلچسپی لے تو رہا تھا مگر اس کے ہاتھوں کی حرکت میں جو الفاظ کے ساتھ ساتھ جاری تھی۔ اسے دوبارہ بولنے پہ اکسانے کے لیے میں نے چھیڑا۔

کی گولیاں لا کے رکھتا تھا۔ زیادہ بیمار بچوں کو خود قبضے لے کر جاتا، علاج کے لیے۔ میری بوڑھی مانی کا سارا خرچہ اٹھایا، اس کی اپنی ماں جیسی خدمت کی۔ اپنی ان ہی عادتوں کی وجہ سے اس نے اپنی عزت اور مقام تو بنا ہی لیا، آج میں بھی صرف اس کے کرموں کا پھل ہی کھا رہی ہوں، یہاں کا بچہ بچہ مجھے تعظیم دیتا ہے، میرے رشتے دار مجھے کسی امانت کی طرح عزیز رکھتے ہیں۔ میں ان کے ساتھ رہتی ہوں لیکن اپنے ابا کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق وہ تمام عقیدے اور ارکان ادا کرتی ہوں، روزے رکھتی ہوں، نماز پڑھتی ہوں۔ کبھی کسی نے میرے کسی عمل پہ اعتراض کیا نہ روکنے کی کوشش کی۔“

”تمہارے ابا کہاں کے رہنے والے تھے؟“ میں نے پوچھا۔

”لاہور نام بتاتے تھے اپنے شہر کا۔ سنا ہے بہت بڑا اور خوب صورت شہر ہے۔ تم نے دیکھا ہے۔“ وہ فرط اشتیاق سے بولی۔

”ہاں کئی بار، واقعی بڑا ہر روز شہر ہے۔ مجھے تو بچپن میں لگتا کہ لاہور کا رہنے والا کوئی شخص اتنے برسوں تک کیسے اس شہر کو بھلائے رکھتا ہے۔“

”عشق..... صرف عشق.....“ وہ جذب کے اسے عالم میں کہنے لگی۔

”ابا جیسا عشق کوئی اور نہیں کر سکتا۔“ اس کی بات میں گولیاں گولیاں ہم بھی اڑائیں خاک بیاباں دشت سے ہم گزر رہے ہیں۔

”دیکھیں گے۔“ اس کے منہ سے پہلی بار شستہ آواز کے الفاظ سن کر میں بڑی طرح چونکا۔

”تم..... اُردو بھی.....“ اس سے پہلے ہمارے مابین صرف پشتو ہی بولی جاتی تھی۔

”تم نے پہلے بتایا ہی نہیں کہ۔“

”تم بھی صاحب.....“ وہ کھلکھلائی۔

”ابھی میں نے بتایا تھا ناں کہ میں پڑھنا اور لکھنا جانتی ہوں تم تب ہی سمجھ جاتے۔“

”ہاں بس وہ.....“ میں نجل سا ہو گیا اس کے سامنے میں اتنا ہوش میں رہتا ہی کب تھا کہ ہر بات کی باریکی میں جاسکوں۔

باوجود دل پہ اثر کرتا تھا۔ ماں کے بعد باا کے اس گیت کے بولوں میں اور بھی درد آ گیا تھا۔“

”پنجابی میں ہوگا۔“ میں نے قیاس کیا۔

”پہ نہیں، بہت مشکل زبان تھی، اردو کے دو تین لفظ تھے اس میں عمریں کا لیا۔“ وہ ذہن پہ زور ڈال رہی تھی۔

”عمریں لگتیاں پہاں پار“ میں بھانپ گیا۔

”ہاں..... ہاں وہی۔۔۔“ وہ اچھلی۔

”پنجابی کا گیت ہے، بڑا مشہور۔ جہاں پنجابی بولی نہیں جاتی وہاں بھی پسند کیا جاتا ہے۔“

”ترجمہ بھی اسے سننا بہت اچھا لگتا تھا، میری ایک پنجابی دوست نے اس کا لفظ لفظ

”مجھے سناؤ ہاں“ میں نے اصرار کیا اور وہی کہتی ہوئی۔

”میں گاؤں کا نہیں۔“ اسے کئی نام نہیں آتا البتہ تمہیں ویسے ہی اس کے بول سنا دیتا ہوں، مطلب کے ساتھ۔“ تب میں نے اسے کئی بول مطلب سمیت سنائے جو بات اسے

”یاد دہانی کی گئی وہ دوبارہ فرما سکتی تھی۔“

عمریں لگتیاں پہاں پار

ہالے دس او کا لیا

جدائی میں گزری بیمار بھی ویران دکھتی ہے، اور سرخ گلابوں کے موسم میں پھولوں

کے رنگ سیاہ نظر آتے ہیں۔“

یہاں اس نے مجھے ٹوک کر دوبارہ اشعار اور مطلب سنے۔

”مجھے کچھ صحیح طرح سمجھ نہیں آیا۔ جدائی کا کرب اپنی جگہ، لیکن پھولوں کا تو جو رنگ

ہے سو وہی رہے گا۔ بھلا سرخ گلاب کالے کیسے نظر آنے لگتے ہیں۔“

”یہ تم بار بار۔“ وہ لوگ، وہ لوگ“ کیا کہہ رہی ہو۔ تم خود کون سی کم ہو۔ یاد نہیں اس

دن بستی میں گھر دکھاتے ہوئے کیا ہوا تھا۔ ہر گھر کے داخلی دروازے پہ بکرے کے دو

سینگ اور پتے لٹک رہے تھے۔ میں نے ہاتھ لگانا چاہا تو تم نے فوراً روک دیا۔

”نہ نہ ہاتھ مت لگاتا۔ انہیں ہاتھ لگانے والا فوراً بیمار پڑ جاتا ہے۔“ حسب توقع اس

کا منہ پھول گیا۔

”اس سے کیا ہوتا ہے، میں کوئی ان کے مذہبی عقیدوں پہ تو یقین نہیں رکھتی۔ نذر

نہیں چڑھاتی، قربان گاہ نہیں جاتی، میرا ایمان بھی وہی ہے جو تمہارا ہے کہ بارش، آندھی،

طوفان بھی زندگی اور موت کی طرح خدا کی طرف سے آتے ہیں اور ہر انسان اپنی زندگی

میں جو کچھ بھی ہوتا ہے اس کی تقدیر میں لکھا ہوتا ہے۔ آئندہ ایسی بات نہ کہو، مجھ سے

برداشت نہیں ہوتا۔ کسی کو کیا خبر میں۔ کن کن حالات میں ایسا ایمان بچائے بیٹھی ہوں۔

وہ زیادہ ہی گرم ہو گئی۔

”اوہو تم تو بڑا مان گئیں۔ میں نے ایسا کب کہا کہ تم خدا نخواستہ .. وہ تو اس دن تم

نے ہی یہ بات کہی تھی جو میں نے یاد دلا دی۔“

”تو کیا ہوا..... ان لوگوں میں پلنے بڑھنے کے پتے انڈیڑھے ہوتے تھے۔ میری نظر اس وقت

بدل سکتے یہ لوگ، عادتوں پہ تو اثر انداز ہو سکتے ہیں۔ پتا ہے ہمارے ہاں چار پائی شام

سے پہلے پہلے جہاں بچانی ہو وہاں بچالی جاتی تھی شام کے بعد کہیں اور منتقل نہیں کی

جاتی۔ گھر کی باقی لوگوں کی طرح میں بھی ایسی معمول پہ چلی تھی۔ لیکن یہ اور بات تھی

دوسری بے ضرر سی باتیں یہ تھوڑا ظاہر کرتی ہیں کہ میں ان میں سے تھی۔ میرا آبا تو ایک

مسلمان تھا۔ لیکن گھر سے نکلتے ہوئے اگر کالی ملی راستہ کاٹ جائے تو سب سے پہلے چھوڑ کر

”بھئی میں تو لفظ بہ لفظ ترجمہ ہی دہرا سکتا ہوں، کوئی شاعر تو نہیں جو شعر کی روح میں اتر کر معنی چرا لوں۔ اتنی شاعرانہ جس ضرور ہے کہ شاعر نے جو کیفیت بیان کی ہے اس کو دل کے اندر تک محسوس کر سکوں لیکن معاف کرنا میں اتنا بڑا زبان دان نہیں جو مکمل تشریح کے ساتھ تمہاری تسلی کر سکوں۔ ہاں اگلے بول سنو جو میں بڑے دل اور جذب کے ساتھ کہہ رہا ہوں شاید یہ بات سمجھ جاؤ۔“

میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ساری مٹھاس اپنے اندر سموتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

غلام فرید میں تاں دوزخ سزساں
جے میں کچھ ماہی کا دلوں دوزان
”اگر کبھی میں نے تم سے مکملہ موڑا، کبھی زندگی میں سارا دل دکھایا، کبھی بے وفائی کی سوچا بھی تو خدا مجھے دوزخ میں پھینک دے، نازل تک جسے کہے۔“

میں اپنا عہد پوری سچائی کے ساتھ دہرا رہا تھا، جب ان شہد سے بھری جھیلوں میں ہکا سا تلام پیدا ہوا اور ایک گلابی تھیلی میرے لبوں پہ بھر گئی۔

☆☆☆

۳۱ مئی ۱۹۸۰ء

فیروز کی اچانک آمد پہ میں حیران رہ گیا۔ وہ دو ہفتے کا کہہ کر گیا تھا اور بمشکل ایک ہفتہ رہ کر واپس لوٹ آیا تھا۔ اس کا شکر رویہ اور کھوجے انداز بھی مجھے متوجہ کر رہے تھے اور پھر اس نے خود ہی ذکر چھیڑ دیا۔

”لالہ میں کیسے رہا ہوں، تم اور... لڑکی؟“

”لڑکی؟“ میں چونکا۔ ”تمہارا مطلب ہے مومنہ۔“

”ہاں وہی۔ مجھے سوات تک اطلاع مل گئی تھی، مجھے یقین بھی نہیں آ رہا تھا کہ تمہارا نام کسی لڑکی اور وہ بھی کسی پہاڑی لڑکی کے ساتھ لیا جاسکتا ہے۔ بہت کم عرصے میں کافی جان چکا ہوں تمہیں اور مجھے یقین ہے تم نے یونہی دن رنگین گزارنے کے لیے تو یہ کھیل شروع نہیں کیا ہوگا۔ یہ تمہاری فطرت میں ہی نہیں اور دوسری صورت میں... یعنی اگر معاملہ سیریس ہے تو..... پھر“

”پھر.....؟“ اس پھر تک تو میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔

”پھر یہ کہ آگے کے بارے میں کیا سوچا ہے۔ میں نے ایران چاہا ہے تمام معلومات لی ہیں اس کے بارے میں۔ اگرچہ وہ دادی کے مذہب سے تعلق نہیں رکھتی، لیکن تمام لوگ اس کی بے حد عزت و تکریم کرتے ہیں۔ اس کے والد کے ان لوگوں پہ کافی احسانات ہیں اور وہ احسان فراموش لوگ ہرگز نہیں، اس لیے کسی قیمتی امانت کی طرح اسے سنبھال کر رکھا ہے۔ اس کے باپ کی وصیت کے مطابق اس کے ننھیال والے کسی مسلمان گھرانے میں ہی اس کی شادی کر سکتے ہیں۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ بستی والے اور یہاں قبیلے کے لوگ بھی کم ہی یقین کرتے ہیں کہ وہ مسلمان ہے، کافر قبیلے کے درمیان پرورش پانے کی وجہ سے اس پر کافر: دینے کا لیبل لگ چکا ہے۔ ایسے میں تمہارا سہارا دینا ان لوگوں کے لیے کسی نعمت سے کم نہیں ہوگا۔ مشکل اگر کوئی پیش آسکے گی تو وہ یقیناً تمہاری طرف سے ہوگی۔“

یہ نہیں تم اتنا بولنا سٹیپ لینے کی اجازت کر پاتے ہو یا نہیں اور اگر کر بھی لیتے ہو تو یہ میں کہ تمہارا خاندان تمہارے اس فیصلے کو قبول کرنے میں کتنا وقت لیتا ہے۔ قبول کرتا بھی ہے یا نہیں؟ یہ بعد کی بات ہے پہلے تم فیصلہ کرو کہ تمہیں کیا کرنا ہے، تم کس حد تک اذہ الو ہو؟ اگر یہ محض وقتی جذبہ ہے اور تم خود میں اس کی خاطر سارے خاندان سے ٹکرانے کی ہمت نہیں پانتے تو میرا خاصانہ مشورہ ہے اس تمام قصے کو ہمیں دفن کرو اور میرے ساتھ چلے جاتے ہو۔ کیونکہ ایران چاہا کو ان کے قبیلے کے بڑوں نے میرے پاس بھیجا ہے اس کے ساتھ کہ عزت کے ساتھ لڑکی رخصت کرانی ہے تو باقاعدہ اس کے ساتھ رہنا ہے، ورنہ ساری مہمان نوازی اور خوش اخلاقی ایک طرف۔

”اس کی طویل تقریر کے اختتام پہ میں نے لمبی سانس کھینچ کے کب سے تنے اہصاب ڈھیلے پیوز دیے۔“

”بہت بہت شکریہ۔“

”کس بات کا؟ خبردار کرنے کا۔“ وہ میرے رد عمل پہ حیران تھا۔

”نہیں میرے جذبوں کو ایک واضح صورت دینے کا۔ میرے قدموں کو ایک صحیح سمت موزنے کا، اور یہ جو کئی دن سے ایک بے نام سی الجھن تھی میرے دل میں کہ اب کیا

اور جو اب اس نے پوری گرم جوشی کے ساتھ مجھے وسیع بازوؤں میں بھینچ لیا تھا۔

یکم جون ۱۹۸۰ء

مومنہ کا طرز عمل میرے لیے ناقابل فہم ہے۔ میں تو سمجھ رہا تھا وہ میری بات سن کے کھل جائے گی۔ اس کی آنکھوں میں تیرتے خوف کے سائے ناپید ہو جائیں گے اور دل میں اپنے بے یقین مستقبل کے حوالے سے بے سوالوں کو جواب مل جائے گا۔ لیکن میری بات سن کے اس کی آنکھوں میں خوف کے سائے اور واضح ہو گئے۔ وہ یوں بدک کے اچھلی جیسے میں نے اسے شادی کی پیش کش نہ کی ہو بلکہ آگ کے دریا میں کودنے کی دعوت دی ہو۔ اس کے دو ٹوک انکار یہ میں بھڑک ہی تو گیا۔

”کیا مطلب ہے تمہارا؟ کیوں نہیں شادی کر سکتیں تم مجھ سے، میں یہ نہیں پوچھوں گا کہ کیا تمہارے دل میں اس لیے کہ کوئی بھی شخص خامیوں سے مزین نہیں ہوتا۔ لیکن اگر تم ہر کسی اور خاکی سے محبت کر سکتی ہو، تو شادی کیوں نہیں...“

”میں نہیں کر سکتی۔ بالکل نہیں کر سکتی۔“ اس کے مسلسل نفی میں سر بلانے پر غصے کے ساتھ ساتھ بے بسی نے بھی مجھے گھیر لیا۔

”میری مجبوری ہے کہ میں تمہاری محبت پر شک بھی نہیں کر سکتا۔ یہ بھی نہیں تصور کر سکتا کہ مجھے سے محبت کا ڈرامہ کیا، مجھ سے جھوٹے اقرار کیے، نہیں۔ نہیں کیونکہ میں جانتا ہوں مومنہ ایسا نہیں کر سکتی، یہ چہرہ کسی کو دھوکا نہیں دے سکتا، یہ آنکھیں کوئی جھوٹ نہیں بول سکتیں۔“

اس لمحے شدت سے میرے دل میں خواہش ابھری کہ میں اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام کے اپنے اپنی آنکھوں میں جھانکنے پر مجبور کروں، لیکن میں نے خود پہ قابو پایا اور دونوں ہاتھوں کے روبرو بیٹھ کے عاجزی سے کہنے لگا۔

”مومنہ خدا کے لیے کچھ سوچو..... وہ کیا وجہ ہے، کون سی مجبوری ہے جو تمہیں اس شادی سے انکار پہ اکسار ہی ہے۔“ میرے بار بار کے اصرار پر وہ اپنے اندیشوں کو زبان دینے پہ تیار ہو گئی۔

”تمہیں بہت آسان لگ رہا ہے ناں یوں سارے خاندان سے کٹ کر مجھے اپنا لینا۔ سارے جہان سے نکل لے کر اپنی من مانی کرنا۔ ایک فرد کی محبت پانے کے لیے دوسرے تمام رشتوں کو ٹھکرا دینا اتنا ہی سہل نہیں۔ یہ جو تم بار بار کہہ رہے ہو۔“ بعد میں

ہوگا..... کیا کروں گا میں..... کیسے واپس جا پاؤں گا..... کیسے رہ سکوں گا اس کے بغیر۔ اس الجھن کا حل میرے سامنے پیش کرنے کا، بہت بہت شکریہ“ میں کھل کر ہنسا۔

”باؤ اسٹوڈنٹ آئی ایم (کتنا حق ہوں میں) اتنی سی بات تھی اور کبھی میرے ذہن میں آئی ہی نہیں۔“

”واقعی.....؟“ فیروز تعجب سے بولا پھر تہقہہ مار کے ہنس پڑا۔

”کمال شے ہے تو بھی یارا زریاب۔“

”اب راہ بھائی دے ہی گئی ہے تو میرا خیال ہے دیر نہیں کرنا چاہیے۔ کیا کل ہی چلیں بات کرنے؟“ میں بے چینی سے کھڑا ہو گیا، جیسے اگلے قدم پہ ہی تو ”کل“ ہے وہ کچھ سنجیدہ ہو گیا۔

”میرا مشورہ ہے کہ تم پہلے اپنے بزرگوں سے بات کرو۔ شاید انہیں کچھ اعتراضات ہوں۔“

”شاید نہیں۔ یقیناً وہ کبھی نہیں مانیں گے۔ کوئی فائدہ نہیں بات کرنے کا۔“

”پھر بھی..... بے شک تم اپنے فیصلے پہ قائم رہو..... اپنی مرضی سے ہر کام کرو.....“

لیکن رسمی طور پہ ہی سہی، تمہیں ان سے بات تو کرنی چاہیے۔ یہ عہد کی بات ہے نہ تمہیں ہمیشہ کے لیے خاندان سے کٹ کے رہ سکتے ہو۔ یہ پوچھنا ہی نہیں ہے کہ وہ تمہیں ان سے چھپا کے شادی کر بھی لی تو۔“

”میں چھپا کے شادی کر رہا ہوں، نہ چھپا کے بیوی کو رکھوں گا۔ ہاں میں فی الحال انہیں اطلاع دے بغیر ان کی غیر موجودگی میں یہ شادی کر کے چھپوں گا۔ رسمی طور پر بھی ان سے اجازت طلب کرنے کا مطلب ہے انہیں الرٹ کر دینا۔ جب ان کے انکار کے کوہنم بھی میں نے اپنی مرضی سے ہی شادی کرنی ہے تو ابھی کیوں نہیں، تم ازم ان کی کوشش

اندازی کا اندیشہ تو نہیں، لیکن اگر باچا جان اور بڑے لالہ کو بھٹک بھی پڑ گئی تو وہ ہر ممکن کوشش کریں گے۔ مجھے اپنے فیصلے اور لہوے سے باز رکھنے کی اور پھر بی بی جان تم جانتے ہی ہو یہ خونی رشتوں کی ایووشن بلک میٹنگ، میں بغیر کسی ذہنی دباؤ اور پریشانی کے اپنی زندگی کا یہ سہرا اور شروں کرنا چاہتا ہوں۔ بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔ کیا تم میری مدد کرو گے۔“

میں نے اچھی طرح اپنا نقطہ نظر اس پہ واضح کرنے کے بعد اس کا تعاون طلب کیا تھا

دیکھیں گے اور بعد میں سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ اس کی کیا ضمانت ہے تمہارے پاس۔
ہو سکتا ہے تمہارے پاس کچھ بھی نہ بچے، نہ ماں، نہ باپ، نہ بہن بھائی، نہ خاندان، نہ
جائیداد۔“

”اور تم..... تم تو رہو گی ناں۔“

”فرخ کرو میں بھی نہ رہی تو۔ ابا نے بھی ماں کے بھرہ سے سب کو چھوڑا۔ لیکن ماں کو
تو زندگی نے بس چھ سال کی مہلت دی۔ اس کے بعد کیا رہا میرے ابا کے پاس۔ میری
صورت میں ایک مستقل ذمہ داری اور بس... میں نہیں چاہتی کل کو پھر سے تم اور میں اسی
عذاب سے گزریں۔ اپنیوں کی بے اعتنائی کا کرب نہیں۔ ماں کے پاس تو پھر بھی ہلکے سے
تمام رشتے موجود تھے۔ میرا دامن تو خالی ہے۔ پھر خود ہی دامان چھوڑنے سے تم کو
گی۔“

”مجھے صرف تم چاہیے ہو مومنہ صرف تم اور تمہارے لیے میں کوئی بھی نقصان اٹھانے
کو تیار ہوں۔ تمہارا ساتھ میری زندگی کے لیے اتنی بڑی آسائش ہے کہ اس کے بعد مجھے
کوئی خسارہ خسارہ نہیں لگے گا۔“

”اور میرے بارے میں کیا سوچا تم نے، میں نے تمہارے بارے میں سوچا ہی نہیں۔ کل ہی
تمہی دامان، آج بھی، اور آنے والے کل میں بھی میرے لیے کوئی رستہ نہیں ہے۔ تمہاری
اور میری محبت آج بھی اتنی ہی تازہ ہے، کسی رشتے کے بغیر بھی، ہماری شادی نہ بھی ہوئی،
تم مجھے کبھی نہ بھی ملے تب بھی میرے دل میں تمہارے لیے وہی مقام رہے گا۔ تم، نینا کے
کسی کو نے میں بھی چلے جاؤ میں تمہاری یادوں میں زندہ رہوں گی۔ تمہاری بات کا لیتین سے
مجھے۔ پھر میں صرف محبت کے نام پر تم سے شادی کیوں کروں۔“

اگر مجھے کسی سے شادی کرنا ہوگی تو وہ ایسا شخص ہوگا جو مجھے ایک ہی رشتے سے
متعارف نہیں کر دے گا، جو مجھے کسی کی بہو، کسی کی بھانجی بنائے گا، جو مجھے ایک بھرے
پرے کنبے میں بسائے گا، مجھے وہ دے گا جس کی مجھے سب سے زیادہ ضرورت ہے اور پھر
چاہے مجھے اس سے محبت ہو یا نہ ہو، وہ مجھے چاہے یا نہ چاہے۔ اگر شادی صرف ایک ہی بار
ہونی ہے تو میں اسی سے کروں گی۔ ورنہ بے نام و نشان تو میں یہاں بھی ہوں، تمہارے
ساتھ جا کے بے سائباں نہیں ہونا چاہتی۔“

”تو پھر میں تم سے عہد کرتا ہوں کہ مومنہ نلی، ایک خنک مرد تم سے وعدہ کرتا ہے کہ تم

پوری آن بان اور وقار کے ساتھ اس کے گھر جاؤ گی۔ چاہے اس کے لیے مجھے کچھ بھی کرنا
پڑے۔“

”تم مجھے آن بان اور وقار کے ساتھ وہاں لے تو جاؤ گے لیکن سب کو مجبور تو نہیں
کر سکو گے کہ وہ میرے وقار کا احترام کریں۔ نہیں خان زبردستی تم مجھے ان کے سردوں پہ
تھوپ کے اور بھی بے توقیر کر دو گے۔ میں سب سہہ سکتی ہوں اپنی بے عزتی اور تذلیل
نہیں۔“

اس کے لہجے میں سختی محسوس کر کے میں چپ کر گیا کہتا بھی کیا، میں ہر طرح کے بلند
بلند دعوے کر سکتا ہوں اور شاید ان پہ عمل بھی لیکن کیا میں واقعی باچا جان کی نظروں میں
اسے بوجھ کر شہیت دلا سکتا ہوں؟ کیا اپنے خاندان والوں کو مجبور کر سکتا ہوں کہ وہ اسے
خنک فیملی کے باختر خنک فرد کی طرح محترم اور عزیز جانیں۔

ایک لمبی جنگ لڑنے کے بعد شاید میرے ماں باپ میری محبت کے ہاتھوں مجبور ہو
کر اس شادی کو تسلیم کر لیں۔ مومنہ کو خنک ہاؤس میں قدم رکھنے کی اجازت بھی مل جائے،
لیکن وہ اتنے وسیع اقلیت پر نہیں ہو سکتے کہ ایک کم نسب و کم حیثیت سی لڑکی کو گھر کے
ساتھ ساتھ دل میں بھی جگہ دے دیں۔ مجھے چپ بی رہنا تھا۔ میں ایسا کوئی وعدہ نہیں کرنا
چاہتا تھا جسے پورا کرنا میرے اختیار میں نہ ہو۔

جون ۱۹۸۰ء
اس ازبیت کی رات کی تمام تر سنا کی میرے چہرے پہ رقم تھی۔ رت جگے اور
تنبہ کی خون آشام سائے آنکھوں سے ہویدا تھے، پلکیں جھپکنے میں بھی سینکڑوں
چہرے چہرے چہرے جاتے تھے۔ میری حالت دیکھ کے فیروز بے چین ہو گیا اس کے پُر خلوص
استفسار پہ میں نے اپنا مسئلہ بیان کر دیا۔ وہی اپنے ارادے کی پختگی اور مومنہ کے انکار کے
پس منظر میں موجود تمام تر اندیشے۔

”فیروز، وہ ایک بار میرا ساتھ دینے پہ تیار ہو جائے تو ہر مرحلہ خود بخود آسان
ہو جائے گا۔ میں ایک دم سے اسے لے جا کے باچا جان کے سامنے نہیں کھڑا کر سکتا، نہ ہی
وہ اسے اس طرح قبول کر لیں گے۔ وہ کم از کم مجھے اتنی مہلت تو دے کہ میں اپنا نام اس
کے نام کے آگے لگا سکوں، مجھے اس کی ہمراہی کا اعتبار آ جائے تو میں تمام دنیا کا سامنا
کراؤں گا۔ بس ایک بار وہ میری مان لے۔“

میں بے بسی سے نڈھال تھا، اس کا اچانک اٹھ کے جانا بھی محسوس نہیں کر سکا۔ چند لمحوں بعد جب وہ واپس آیا تو خوشی سے چہرہ گھنار تھا اور عجالت و بے تابی اس کی بر حرکت سے عیاں تھی۔

”اٹھو خان خاناں..... اٹھو جان جاناں..... آؤ تمہیں بنا کیں سنواریں..... جلدی کرو، کام زیادہ اور وقت کم ہے۔ پہلے تو یہ لٹکا ہوا چہرہ اصل حالت میں واپس لاؤ، پھر انجینئر خاں سے تجامت وغیرہ بناؤ، کچھ شکل پر رونق لاؤ۔ میرے یار کی بارات نکلی ہے آج۔“ اس کی بے ربط گفتگو میری سمجھ سے باہر تھی۔

”کیا کہہ رہے ہو؟ کس کی بارات؟ کون سا یار؟“ وہ میرے پاس ہی بیٹھ گیا۔

”میں گیا تھا مومنہ کے پاس، کچھ باتیں اس کی بھی پتھر تھیں، اس کے اٹھنے کے بعد اپنی فکریں تھیں بڑی خود دار اور ناموس والی لڑکی تھی۔ ایک نختون زادے کو چاہیے۔ ایسی شریک حیات جو آن بان اور شان میں صحتی ہو۔“

وہ بجانے اور کتنی دیر مومنہ کے قصیدے پڑھتا کہ جس نے خواب دیا۔

”تمہاری بات کیا ہوئی اس سے، مجھے یہ بتاؤ۔“

”قصہ مختصر یہ کہ وہ تم سے شادی پہ تیار ہے۔“ اس نے بالکل ہی حتمی بات کہہ دی

، جب کہ میں اس کی تفصیل جاننے پہ بے تاب۔

”اوہو مگر یہ ہوا کیسے، تم نے کیا کہا اس سے؟“

”اسے اعتماد دیا ہے، جس سے اس کی ذات نا آشنا تھی۔ اسے وہ رشتہ دیا ہے جس

کے سہارے وہ اپنے قدم مضبوطی سے جما سکتی ہے۔ یار عورت بڑی عجیب چیز ہے! محبت کے بارے میں بڑی رحم ہے اس کے اندر، چاہتی ہے کہ اسے شادی سے محبت سے جڑے اور پھر مومنہ جیسی عورت جس سے قدرت نے ہر رشتہ چین لیا تھا۔ اس کے اندر تو یہ طلب اور بھڑکی ہوئی تھی۔ میں اس سے تیرا یار بن کے ملنے گیا تھا لیکن اسے بہن بنا کے آ رہا ہوں۔“

اور پھر وہ اپنی ذات اور تقدس کے حوالے سے بے حد حساس ہے بڑے بڑے خراب حالات اور ناساعد ماحول میں بھی اس نے خود کو سنبھال کے رکھا ہے۔ اپنی پاکیزگی، اپنے ایمان پہ غرور کی حد تک ناز ہے اسے۔ وہ نہیں چاہتی کہ کوئی بھی اسے یا اس کے کردار کو نشانہ بنائے۔ جب کہ تمہارے اپنی پسند کی شادی کر لینے کی صورت میں کم از کم

تمہارے گھر والوں سے تو اسے یہ طعنے سننے ہی پڑیں گے۔ اس کا حل بھی میں نے سوچ لیا ہے۔ تمہارا نکاح ابھی اسی وقت قصبے کی مسجد میں ہوگا۔ صبح ہم سب سیدہ شرافت روانہ ہوں گے اور میری جویلی سے مومنہ رخصت ہوگی۔ تب جب تم اپنے والد یا بھائی کے ساتھ اسے لینے آؤ گے۔ یہ بات طے ہو چکی ہے اور اس سلسلے میں تم کوئی اعتراض نہیں کرنا۔“

”لیکن تم نے یہ فیصلہ...“

”صرف اور صرف اپنی بہن کو یہ یقین دلانے کے لیے کہ اس کے کردار و مقام پہ کوئی حرف نہیں آئے گا اور اپنے یار کو اس کی تمام خوشیاں دلانے کے لیے مجھے یہ فیصلہ کرنا پڑا۔ اچھا اب تفتیش کرنا بند کرو اور اٹھ کر دو جنگ کے کوئی کپڑے پہن لو، اگر ہیں تو اسے مجھے بازو سے پکڑ کے اٹھایا۔“

میں... میری تو وہ حالت تھی کہ میں اس کا شکر یہ تک ادا نہیں کر سکا اور اچھا ہی ہوا۔ جلا الفاظ اس کی محبت اور اٹھوں کا حق ادا کر سکتے تھے۔ میں خوشی سے گنگ تھا جب کہ سر تیس اظہار کے لیے بے تاب، اسی لیے فوراً تم سے اے میری ڈائری، تم سے اپنی خوشی شیئر کرنے بیٹھ گیا۔ جب کہ آتے جاتے مختلف انتظامات میں مصروف فیروز کی پکار مجھے بار بار شرب کر رہی ہے۔

جون ۱۹۸۰ء

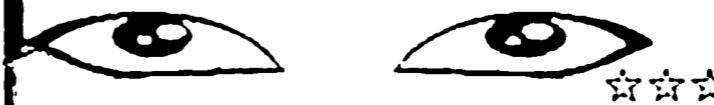
آخر مومنہ علی، مومنہ زریاب خنگ بن ہی گئی۔ چاہے کسی بھی طرح ہوئی مگر یہ سارا سارا تمہاری زندگی کی ضد کہ میرے گھر والے خود اسے رخصت کرانے آئیں اور میری بچیوں کو باچا جی کی صورت میں بھی کافرستان اپنے بیٹے کی دلہن ڈھونڈنے نہیں آ سکتے تھے۔ ان سے اسے کبھی کسی نکلنے کے میں لے جانی نہیں سکتا تھا۔ یہ شادی یونہی ہوئی تھی جسے اس نے سوا کوئی چارہ نہیں کہ میں سب کی دو تھیلوں کو بس پیاسا ہی تکتا رہوں۔ ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ ان کی مناس سے میرے لب سیراب ہوں۔ یہ شادی یونہی کیوں ہوئی تھی؟ کیوں؟ میں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا کہ خان ار باب خنگ کا سب سے اائق نائق اور لاڈلا بیٹا خان زریاب خنگ، سرحد کے مشہور خانوادے کا چشم و چراغ سینکڑوں میل پہ پھیلی اراضی اور کبروڑوں کی جائیداد کا وارث، اپنی بارات میں چند پہاڑی لوگوں کی ٹولی لے کر مانگے کا شلوار سوٹ پہن کر پیدل، کافرستان کی بستی میں جنگ گلی کے آخری کونے پہ موجود لکڑی اور پتھروں سے بنے اس دو منزلہ مکان تک چل کے جائے گا۔

درد از سے پہ موجود چند بزرگ عورتوں نے میرا استقبال کیا اور میرے گلے میں خشک میوہ جات سے پر دیا ہوا ایک ہار ڈال کر خیر مقدمی گیت گائے۔ گھر کے کچے احاطے میں کئی بچیاں تالیاں پیٹ پیٹ کے بے حال ہو رہی تھیں۔ نکاح مسجد میں ہو چکا تھا۔ مومنہ کے ماموں اور خالہ چونکہ مسجد تک نہیں آسکتے تھے اس لیے ان کی خوشی کے لیے میں خود چل کے یہاں تک آیا تھا، تاکہ وہ اپنے رسوم و قواعد کے مطابق اسے رخصت کریں۔ لیکن مجھے اندازہ نہ تھا کہ یہ رسمیں اس قدر فضول اور بے زار کن ہوں گی۔ خصوصاً اس وقت تو میں جھلا گیا جب میرے ہی پاؤں کے موزے اتروا کے انہیں جلانے کے بعد مجھے دھوئی دی گئی۔ میرے چہرے پہ ناگواری محسوس کر کے ایران چا جانے بتایا۔

”بچہ یہ تمہاری نظر اتارنا ہے۔ جب دو محبت کر کے دیکھنے والے ایک ہو جاتے ہیں تو ان لوگوں کی زوہیں تڑپ جاتی ہیں۔ جنہیں دنیا میں اپنی محبت تک نہیں ہوتی۔ اس کے حسد اور نظر بد سے بچانے کے لیے یہ انہیں تمہیں دیکھنے سے روک دیتے ہیں۔“

اور کوئی یقین نہیں کرے گا، کہ میں۔۔۔ جی نہیں ہاں محسوسوں کے خوف سے دبک کے بیٹھ گیا اور چپ چاپ نظر اتروانے لگا۔

کون کہتا ہے محبت دلیر ہوتی ہے۔ جی نہیں محبت تو بزدل ہوتی ہے۔ ذرا سے خطرے کو محسوس کر کے ہم جاتی ہے۔



URDU PHOTO

خان زریاب خشک۔
مومنہ علی۔

اور.....
فیروز وردگ۔

ایک سیدھی سادی کہانی کے آسان نم سے کردار۔
پھر ابہام کہاں ہے؟ الجھاؤ کہاں سے شروع ہوتا ہے؟

شاید تب جب باچا جان کو بابا کے اس جرات مندانہ اقدام کی خبر ملی ہوگی۔ یا تب جب بابا جان ماما کو لے کر یہاں آئے ہوں گے۔ لیکن تب، اس وقت فیروز وردگ کا کیا کردار رہ جاتا: دوگا اس ساری کہانی میں، کیوں ان کا نام اب بھی بابا جان کے حوالے سے اس قدر خوف و ہراس کے ساتھ لیا جا رہا ہے۔۔۔ کیوں؟ آخر کیوں؟

مقدس پہ جان لینے کی بے تابی سوار تھی۔ لیکن ساتھ ساتھ ہی تحریر کا جو دو بھی اسے جکڑ رہا تھا، وہ اپنے ماں باپ کے ہمراہ ان تمام احساسات کو خود پہ گزرتا دیکھ رہی تھی۔ نہ چاہتے ہوئے لہجی ایک ایک سطر پڑھنے پہ مجبور تھی۔ ورنہ شاید دل تو اس کا ڈائری کے اختتامی صفحات میں اٹکا ہوا تھا۔



ایک دھڑکتا ہوا سانا پھیلا ہوا تھا پورے کمرے میں صرف باچا جان کی اکٹری اور دشوار سانسوں کی آمد و رفت کا شور تھا یا پھر بی بی جان کی دبی دبی سسکیوں کی مدھم آوازیں۔ ضیاء گریہ سے ان کی بلوریں آنکھیں سرخ ہو چکی تھیں۔ سفید بڑ جلال چہرے پہ زردی کھنڈی تھی اور دانتوں سے نیش کے ساتھ اپنے لب سسکیاں روکنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ خان افراسیاب خشک نے یکدم اٹھ کر کمرے میں ٹہلنا شروع کر دیا۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ وہ اب مزید خاموش نہیں رہ سکتے تھے۔ خان دراب خشک نے بھی ڈاکٹر کی تازہ ترین رپورٹ کو دسویں بار پڑھنے کا ارادہ ترک کرتے ہوئے بھائی کو دیکھنا شروع کر دیا کہ کب وہ اپنی گفتگو کا آغاز کرتے ہیں۔ تیسری بار بی بی جان کے سامنے گزرتے ہوئے اچانک پلٹنے اور والد محترم کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولے۔

اپ کی وجہ سے باچا جان..... صرف اور صرف آپ کی وجہ سے زریاب کا یہ حال ہے اور آپ کے بے حال ہونے کی وجہ سے آج ہم سب کی حالت دگرگوں ہے۔ ہر چیز میں آپ کی وجہ سے ہی ہے اس کی ہر فضول حرکت اور بے کار مشاغل کو بڑھاوا دینے کے لیے اس سے روایت لیکن اقدام سے چشم پوشی کرنے والے اور اس کی ہر ضد اور کڑی کے آگے کمزور پڑنے والے۔“

خان ارباب خشک کے ناتواں اور جھریوں بھرے چہرے یہ موجود آنکھیں حیرت سے پوری طرح کھل گئیں۔ اپنی پوری زندگی میں انہوں نے بلاشبہ پہلی بار کسی کی اتنی اونچی آواز سنی تھی۔ پہلی بار کوئی ان کے سامنے ان کے جرم گنوار ہاتھ اور انگلی اٹھانے والا کوئی اور نہیں ان کا اپنا بیٹا، ان کا بڑا بیٹا خان افراسیاب خشک تھا۔

غم و غصے کی شدت سے ان کی رگیں ابھر آئیں اور سانس گویا چند لمحوں کے لیے ڈوب ہی گئی۔ بی بی جان تڑپ کے انٹھیں لیکن ان سے پہلے ہی دراب نے لپک کر آکسیجن کی پائپ سیٹ کر دی۔ وہ وہیں اپنے خان کے سر ہانے کھڑی شیخ کے دانے

گرانے لگیں۔ دراب نے باچا جان کے ہاتھ سہلاتے ہوئے بڑے بھائی کو ماتمی نظروں سے گھورا۔

”بڑے لالہ، پلیز اپنے آپ پر کنٹرول کیجئے۔ باچا جان کی حالت ایسی ہرگز نہیں کہ وہ آپ کی تند و تیز باتیں سہہ سکیں۔“

”باپ بستر پہ ہے، لاغر ہے، مجبور ہے، بے بس ہے مگر۔۔۔“ بی بی جان نے بھی برستی آنکھوں سے بڑے فرزند کو دیکھا۔

”مت بھولو کہ وہ تمہارا باپ ہے۔ اپنے بڑوں سے اس طرح پیش آنا تو ہم نے تمہیں نہیں سکھایا افراسیاب۔“

”یہ ہی تو رونا ہے آپ نے جو کچھ سکھانا تھا بس مجھے زور سا لگے اور دراب کو سکھایا سارے حدود و قیود کا احترام، برادریوں اور ان کی اسراری کی بر حال میں مقیم رہنا۔ خاندانی حرمت و ناموس کو بتایا ہر چیز پر اولیت ہے۔ کاش۔۔۔“ بی بی جان نے کچھ سکھایا ہوتا۔ لیکن اسے یہاں رہنے کا موقع ہی کب ملے گا وہ یہاں رہتا تو اسے اپنی روایات و خاندان سے انس بھی ہوتا۔ باچا جان کی طرف سے اسے کھلی چھوٹ مل گئی تھی، بخارہ بن گیا تھا وہ۔۔۔ مگر گھر گھومنے والا۔۔۔ اور بخارن ہی اٹھالایا گھر میں۔“

”لالہ کی طبیعت میں ہی ٹھہراؤ نہیں تھا۔ یہ جاگیر اور قلعہ و پابندیاں سب ان کی فطرت سے بہت دور کی چیزیں تھیں۔ اس میں باچا جان یا بی بی جان کی تربیت کو مہور و الزام ٹھہرانا نااط ہے۔“ دراب نے کہا۔

”اولاد کو لگام ڈالنا تو فرض ہے ماں باپ کا اور ایسی کی ایسی فطرت اور طبیعت کی جو اپنے ساتھ ساتھ دوسروں کی بھی زندگیوں داؤ پر لگا دینے پر تیار نہ تھے۔“

”نہ اس کی سوچ بے لگام ہوتی، نہ وہ گھر سے بے زار ہو کر ہٹکتا پھرتا، نہ فیروز جیسے گمراہ کر دینے والے یاروں دوستوں کے چنگل میں پھنستا اور نہ وہ کافرستان کی پیازن است نئی اور اگر یہ سب دونا ہی تھا، ہو ہی چکا تھا تو کیا ضرورت تھی باچا جان کو اس طرح اس کے آگے ہار مان لینے کی، کیوں بھاگ گئے تھے اس کی پسند کو اپنانے کے لیے۔ کیوں اس کی ناخانی اور نافرمانی کو نظر انداز کر کے اس کی حوصلہ افزائی کی۔“

ماں باپ کی اجازت کے بغیر انہیں بے خبر رکھ کے ایک حقیر اور بے مایہ لڑکی سے

نکاح کر لینا اتنا قابل معافی جرم نہیں تھا۔ انہیں چاہیے تھا اسے قید میں ڈلوادیتے۔ لڑکی کو مرد کے کلام ہی کے پہاڑوں میں پھینکوا دیتے۔ عشق کا چند روزہ بخار اتر ہی جاتا تھا ایک دن۔“

”بعض جادو سرچہ کے بولتے ہیں۔“ بی بی جان نے سرد آہ بھری۔

”اپنی ہی اولاد کو خود اذیت دینا آسان کام نہیں۔ اس لڑکی کو مروانا ناممکن نہیں تھا لیکن تم نہیں جانتے اس وقت زریاب کا جنون کس درجے کا تھا، اسے کھودینے کے ڈر سے

خان جی اس لڑکی کا بال بھی بیکانہ کر سکے مگر یقین کرو انہوں نے ہر ممکن کوشش کی تھی اسے اس کے ارادے سے باز رکھنے کی۔ لاقاعی اختیار کرنے کی دھمکی بھی دی اور عاق کر دینے کا ڈر دیا بھی لیکن سب بے سود۔ وہ پہلے ہی ہر چیز سے بے زاری ظاہر کرتے ہوئے چھوڑ

دینے پہ تیار تھا۔ خان جی اس کی محبت کے ہاتھوں مجبور ہو گئے تھے۔ تم ایک باپ ہو، باپ کی مجبوری جان سکتے ہو۔“ انہوں نے شوہر کی طرف سے سفائی پیش کی۔

”میں صرف ایک باپ ہی نہیں۔ ایک بھائی بھی ہوں۔“ افراسیاب تھکے تھکے انداز میں کرسی پہ گر گئے۔ ان کے انداز سے بے چارگی ظاہر تھی اور آواز میں شگفتگی۔

”اس کی جوانی برباد ہونے کا غم کیا مجھے نہیں ہوگا۔ آپ کا کیا خیال ہے۔ پچھلے بیس

سال میں گھر کے کسی بھی فرد نے پرسکون گزارے ہیں۔ کون ہے جو رات کو انگاروں پہ نہیں لوٹتا۔ یہ سوچ کر کہ خان زریاب خنک جیسا نہیں اور حسین شہزادہ۔۔۔“ دراب کی

بے چارگی نے افراسیاب کی قیاس کی تائید کر رہی تھی۔

”نہ اس کی سوچ بے لگام ہوتی، نہ وہ گھر سے بے زار ہو کر ہٹکتا پھرتا، نہ فیروز جیسے گمراہ کر دینے والے یاروں دوستوں کے چنگل میں پھنستا اور نہ وہ کافرستان کی پیازن است نئی اور اگر یہ سب دونا ہی تھا، ہو ہی چکا تھا تو کیا ضرورت تھی باچا جان کو اس طرح اس کے آگے ہار مان لینے کی، کیوں بھاگ گئے تھے اس کی پسند کو اپنانے کے لیے۔ کیوں اس کی ناخانی اور نافرمانی کو نظر انداز کر کے اس کی حوصلہ افزائی کی۔“

ماں باپ کی اجازت کے بغیر انہیں بے خبر رکھ کے ایک حقیر اور بے مایہ لڑکی سے

نہ اس کی سوچ بے لگام ہوتی، نہ وہ گھر سے بے زار ہو کر ہٹکتا پھرتا، نہ فیروز جیسے گمراہ کر دینے والے یاروں دوستوں کے چنگل میں پھنستا اور نہ وہ کافرستان کی پیازن است نئی اور اگر یہ سب دونا ہی تھا، ہو ہی چکا تھا تو کیا ضرورت تھی باچا جان کو اس طرح اس کے آگے ہار مان لینے کی، کیوں بھاگ گئے تھے اس کی پسند کو اپنانے کے لیے۔ کیوں اس کی ناخانی اور نافرمانی کو نظر انداز کر کے اس کی حوصلہ افزائی کی۔“

ماں باپ کی اجازت کے بغیر انہیں بے خبر رکھ کے ایک حقیر اور بے مایہ لڑکی سے

زریاب کی زندگی سے کھیننے کی۔“

”گزرے وقت کو کون سے کیا فائدہ لالہ۔ آپ بس اب کسی طرح کچھ ایسے انتظامات کریں کہ زریاب لالہ کو فوراً یورپ، یا آئینس بھیجا جاسکے۔“

”ہوں..... کچھ ایسا ہی سوچ رہا ہوں میں بھی۔“

☆☆☆

وہ لے جاتا ہے سورج مجھ سے بیٹنے کی سکت
رات بھر بن بن کے دن بھر ٹوٹتا رہتا ہوں میں
وقت کی آندھی سے کھل کھل جاتی ہے میری گرہ
خود کو کس کس کے ہر وقت بندھتا رہتا ہوں
ہردن پہلے سے کہیں بڑھ کے پیزاکن اور ہر رات پہلے سے کہیں بڑھ کے طویل تر
ہر صبح کا سورج اپنے ہمراہ نیراز چہرے لانا ہے اور ہر شام کی بھلی
تاریکی کے جلو میں ڈھیروں ڈھیروں یادوں کے تارے ہوتے ہیں۔

یادیں۔

جو اور بھی نڈھال کر دیتی ہیں

یادیں.....

جو اور بھی تنہا کر دیتی ہیں۔

کاش ایسا ہو کہ کسی روز سورج نکلے، مگر اسے میرے ہمتے ملتے وجود کی پرچھائیاں
بھی نہ ملیں سارا دن میرا تماشا دیکھنے والا شرمندگی سے اپنی ہی جد سے آغوش میں منہ
چھپالے کاش ایسا ہو۔

کاش ایسا ہو کہ کسی روز شام ڈھلے مگر اس کی تاریکی کا ساتھ دینے کے لیے اسے
نہ ملوں۔ یادیں... ان بوسیدہ دیواروں سے نگریں مارتی پھریں لیکن اس دل و دماغ تک
پہنچنے والے تمام رستے اندھے ہو چکے ہوں، جہاں ہر رات یہ یادیں دھاوا بولتی ہیں۔ کاش
... کاش آہ...

ایسی سرد آہ کھینچتے ہی اس کی سانس پھر سے اکھڑ گئی، اس نے پورا منہ کھول کے اس
مختصر سی چار دیواری میں موجود کثیف سی فضا سے زندگی کھینچنے کی کوشش کی، لیکن جیسے سانس
کے تمام رستے تنگ پڑ چکے تھے۔ سینہ دھونکنی کی طرح چلنے لگا اور حلق سے عجیب آوازیں

نکلنے لگیں اس نے اپنا اونڈھا سیدھا وجود بمشکل کھڑا کیا اور دیوار کے ٹھنڈے لمس کا سہارا
لے کر سیدھا بالکل سیدھا کھڑا ہو کے سر اُونچا کر کے سانس ہموار کرنے لگا۔

اپنے آپ سے ہم سخن رہنا
ہم نشیں، سانس اکھڑ جاتی ہے

☆☆

اور یہ آخری چند صفحات

مقدس نے چونک کے ننیم ڈائری اور پھر وال کلاک کی جانب دیکھا۔

”آج سے پہلے میں کس قدر انجان تھی گو کچھ بھی تو نہ جانتی تھی، کہاں ہیں میرے بابا
جان..... کسی نے میری ماما..... کون ہیں وہ.....
اور آج ایک ایک نقش جیسے میرے دل پہ نقش ہے اس حسین چہرے کا..... وہ چہرہ جو
میری ماں کا ہے۔
اور آج جیسے میں دل کے اندر تک اتر چکی ہوں..... اس کے دل کے اندر..... جو

میرے باپ کا ہے۔
کاش ایسا ہو کہ کسی روز سورج نکلے، مگر اسے میرے ہمتے ملتے وجود کی پرچھائیاں
بھی نہ ملیں سارا دن میرا تماشا دیکھنے والا شرمندگی سے اپنی ہی جد سے آغوش میں منہ
چھپالے کاش ایسا ہو۔
کاش ایسا ہو کہ کسی روز شام ڈھلے مگر اس کی تاریکی کا ساتھ دینے کے لیے اسے
نہ ملوں۔ یادیں... ان بوسیدہ دیواروں سے نگریں مارتی پھریں لیکن اس دل و دماغ تک
پہنچنے والے تمام رستے اندھے ہو چکے ہوں، جہاں ہر رات یہ یادیں دھاوا بولتی ہیں۔ کاش
... کاش آہ...
ایسی سرد آہ کھینچتے ہی اس کی سانس پھر سے اکھڑ گئی، اس نے پورا منہ کھول کے اس
مختصر سی چار دیواری میں موجود کثیف سی فضا سے زندگی کھینچنے کی کوشش کی، لیکن جیسے سانس
کے تمام رستے تنگ پڑ چکے تھے۔ سینہ دھونکنی کی طرح چلنے لگا اور حلق سے عجیب آوازیں

نجانے یہ کون سی کہانی سنائیں۔ شاید انہیں میں وہ راز قید ہو، وہ بھید فتن ہو، شاید
یہی مجھے میرے ماں باپ کا سراغ دے جائیں۔“

اس نے ایک امید کے سہارے تھکی ہوئی آنکھوں کو پھر سے پڑھنے پہ آمادہ کیا۔
اگرچہ اس ڈائری کے مطالعہ کے دوران وہ کچھ اس طرح کھو گئی تھی کہ یہ بات ذہن سے
نکل ہی گئی کہ وہ اصل میں کیا جاننا چاہتی ہے، لیکن اب آخری دو تین صفحات نے اس کی
بے چینی پھر سے بڑھادی تھی۔ یہ ڈائری ہی وہ واحد ذریعہ تھی جس سے وہ اتنا کچھ جان پائی

میرا دل کرتا میں زرسا نگہ باجی کے پاس بیٹھ کے انہیں وہ تمام واقعات سناؤں جو مجھے اپنے پچھلے سفر میں پیش آئے تھے اپنی آنکھوں سے انہیں دنیا کی سیر کراؤں لیکن ان کے پاس اپنی سہیلیوں اور کزنز کے جہیزوں اور رشتوں کے حاسدانہ تذکروں کے سوا کچھ نہ ہوتا تھا۔ اور بڑے لالہ..... ان سے میں محبت کرتا ہوں لیکن احترام کے ساتھ وہی احترام جو مجھے باجا جان سے قریب نہیں ہونے دیتا وہی احترام میرے اور لالہ کے درمیان بھی حائل ہے۔ اسی لیے میں نے سوچ رکھا ہے کہ میں اپنے اور اپنی اولاد کے درمیان ایسا کوئی رعب و دبدبہ نہیں رکھوں گا کہ کھل کے محبت کا اظہار بھی نہ کر پائیں گے ہم ایک دوسرے سے، پھر آخردراب کے ساتھ کیا مسئلہ ہے۔ وہ مجھ سے چھوٹا بھی ہے، بارورڈ میں پڑھتا ہے۔ پھر کیوں نہیں ہمارے مزاج ملتے۔ کبھی کبھی تعلیم بھی انسان کا کچھ نہیں سکتی۔ بارورڈ سے آنے کے بعد وہ یہاں مرغوں اور بازوں کی لڑائیوں کے کھیل کھیل رہا ہے، جنگلی سوروں کا شکار کرتا ہے، باجا جان کی شوقہ دشمن دار پوٹوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا ہے اور پھر چٹھیاں ختم ہوتے ہی تعلیم میں مگن ہو جاتا ہے۔ کبھی کبھی کھیلے جاتا ہے ہم تینوں بھائیوں میں سے وہی اصل خاندان ہے کہ باجا جان کے بقول اس کے تینوں ہی اصل نسل خانوں والے ہیں۔ اگر ہر وقت بندوق اٹھائے رکھنا سنگاٹخ پہاڑوں پہ خاک اڑائے پھرنا اور پر بیت جنگلوں میں واہیات قسم کے جانور شکار کرتے پھرنا ہی خان ہونے کی شان ہے تو میں باز آیا ایسی سرداری سے۔ مجھے تو شہر و دیہات سے رنگ، خوشبو اور دھواں انریکت کرتی رہی۔ جہاں جہاں رنگ نظر آئے میں چرانے گیا۔ جہاں سے خوشبو آتی میں اس کے تعاقب میں بھاگا اور ایسے میں صرف یہ ڈائری ہی تو تھی جو میرے ہر تجربے میں شریک تھی۔

پھر مومنہ آئی... اور میں جو سوچے بیٹھا تھا کہ خانہ کی کھالیں اور کھالیں کھالیں کروں گا چاہے زندگی بھر کنوارا ہی کیوں نہ رہنا پڑے، کیونکہ کسی میٹرک پاس سے میری ذہنی مطابقت ہرگز نہیں ہو سکتی تھی اور لڑکی بھی وہ جو پشاور سے آگے صرف چار سداہ اور نو شہرہ تک گئی ہو۔ وہ میرے پر گئے وجود کا ساتھ کہاں تک دے پائے گی۔ لیکن مومنہ... اس نے ہیرے سارے تجربات غلط ثابت کر دیے۔ میں جان گیا کہ ذہنی مطابقت کے لیے تعلیمی سطح کا یکساں ہونا ضروری نہیں اور وہ لڑکی جو میٹرک تو کیا پانچ جماعتیں بھی نہ پڑھی ہوئی تھی..... جو اس بیٹھوی دادی کے چاروں طرف کھڑے پہاڑوں سے باہر کی دنیا

تھی اور یہی ڈائری وہ واحد ذریعہ ہے جو اس کو اپنے باپ کا سراغ بھی دے سکتی تھی۔ وہ یہ تو جان ہی چکی تھی کہ شادی کے بعد بابا جان کو کتنا وقت لگا باجا جان کو رضامند کرنے میں اور کیا کیا دھمکیاں دے کر انہوں نے بی بی جان کو مجبور کیا تا یا جان کی ناراضگی کا ذکر بھی تھا اور پھوپھی جان کی برہمی کا بھی۔ ماما کے اندیشے بھی بیان کیے گئے تھے اور ان تمام واقعات کا بھی سرسری سا ذکر تھا جو شادی کے بعد حویلی میں پہلی بار آنے پر پیش آئے تھے۔

باجا جان نے ناپسندیدہ بہو کو تسلیم کرنے کے لیے بابا جان کی آوارگی خرید لی تھی۔ ان کے سیر و سیاحت کی شوق پہ پابندی لگا کر کاروبار میں شریک ہونے کی شرط رکھی تھی۔ یہ بھی اندازہ ہو جاتا تھا کہ اپنی پسند کو زبردستی تسلیم کروانے کے باوجود بابا جان انہیں گھر کے افراد کے دل میں جگہ دینے سے قاصر رہے تھے لیکن ان سب باتوں کے ساتھ ساتھ خوشوار شب و روز کا تذکرہ یہ بھی ظاہر کرتا تھا کہ اہل خانہ کے کھینچے کھینچے روئے اور ناراضگی کے باوجود دونوں مطمئن اور شاد تھے اگرچہ اب ڈائری میں خاصی بے تاعدگی آگئی تھی، کہیں چار روز تو کہیں دو ہفتے کے وقفے سے لکھی گئی تھی لیکن کہیں سے بھی دونوں کے مابین بلی بلی کی سی چپقلش اور ناچاقی کا ذکر نہیں ملتا تھا۔ وہ حیران تھی کہ اتنی اندر اسینڈنگ کے بعد آج کیا بات تھی جس نے یکا یک دونوں کے راستے الگ کر دیے۔ اس نے ڈائری پر

یقین نہیں آتا کہ میں اور بے ڈیڑھ سال بعد ڈائری لکھ رہا ہوں۔ مومنہ کے ساتھ بے اندر بسی تنہا نہیں کو یکسر کر ڈالا ہے اور اب مجھے اپنے احساسات و جذبات بیان کرنے کے لیے کاندھ کے بے جان لکڑوں کی ضرورت نہیں رہی۔ میں نے خود کو ہمیشہ اس خاندان میں مس فٹ محسوس کیا۔

اپنے تمام لوگوں سے محبت کرنے کے باوجود بھی ذہنی طور پر میں خود کو ان سے بہت فاصلے پہ پاتا تھا۔ چلو بی بی جان، زرسا نگہ باجی وغیرہ سے ذہنی مطابقت نہ ہونے کی ایک وجہ تعلیم بھی ہو سکتی تھی، وہ گھر کی دیواروں میں قید رہنے والی خواتین تھیں اور ظاہر ہے کہ ان کی ذہنی سطح بھی اس درجہ کی ہی تھی۔ ان کے ساتھ بیٹھنے کے میں ہمیشہ ہی خاندانی جھگڑوں کی تفصیل اور رشتوں کے تانے بانے سن سن کے بور ہوتا تھا۔

کو بالکل بھی نہیں جانتی تھی۔ وہ لڑکی میری سب سے قریبی ہستی بن گئی۔ میں اسے اپنی روح کے اندر محسوس کرنے لگا۔ اسے اپنے ذہن میں روشن دیکھنے لگا اور دل کے اندر دھڑکتا سننے لگا..... پھر..... پھر کیسے میں اسے کھودیتا۔ مجھے اسے پاتا ہی تھا چاہے اس کے لیے مجھے سب کچھ کھونا پڑتا یہ میں نے خود سے وعدہ کیا تھا۔ لیکن شکر ہے کہ مجھے کچھ کھونا نہیں پڑا۔

اسے اس حویلی میں لانے کے لیے کچھ مشکلات تو پیش آئیں لیکن بہت جلد سب کچھ صحیح ہو گیا۔ اگر میں نے کچھ کھویا تو محض اپنی آزادی۔ باچا جان نے میری خواہش کے بدلے میری آزادی طلب کی تھی اور تب میں نے سوچا تھا کہ میں بہت بڑی قیمت چکا ہوں۔ اب سوچتا ہوں تو ہنسی آتی ہے، کاش باچا جان آپ نے کچھ اور مانگ لیا ہوتا۔ میرا صبر انور دی تو یوں بھی ختم ہوتا ہی تھی۔ مہینوں بعد جب کبھی آکر دیکھتا تو باچا جان ہنسنے سے لگ کے ٹھنڈک سی اتر جاتی تھی وجود میں، بی بی کے ہاتھوں کے ہاتھوں کے ہاتھوں پر سکون کر دیتے تھے لیکن کچھ ایسا نہ تھا جو مجھے رکنے پہ مجبور کرے۔ چند ہی دنوں بعد میں پھر سے نئے سفر پہ جانے کے لیے کمر کس لیتا۔ اب احساس ہوتا ہے کہ پاؤں میں بیڑیاں کیسے ڈلتی ہیں۔

میرا سب کچھ تو یہاں ہے اس حویلی میں پھر سندرہ چار لکھنے جائیں گا۔ شاید وہی تھی جس کی تلاش نے مجھے دنیا کھٹکانے پہ اکسایا اور ہاں اک اور تحفہ، مقدس اس کے آنے کے بعد تو اب کاروبار میں بھی دل نہیں لگتا، پہلے ہی خانسی مشکل سے دل اودھانے دو دنوں کو اس جانب راغب کیا تھا لیکن اس کے ننھے ننھے ہاتھوں کی گھنٹی۔ اپنی ہانڈی چھڑا کے گھر سے نکلنا کس قدر دشوار لگتا ہے۔ پھر بھی..... سو پڑا۔ یہ لڑکی..... بری طرح مشغول ہو جانے کے باعث لالہ کار، تھان کاروبار کی طرف کم ہی ہو گیا تھا اور میرے دلچسپی لینے کے بعد تو ان کا عمل دخل بس برائے نام ہی رہ گیا ہے۔ باچا جان کا بلڈ پریشر بھی بہت ہائی رہنے لگا ہے، جاپان جانا مجھی ضروری ہے ورنہ ایک بڑی ڈیل ہونے سے رہ جائے گی۔ مومنہ کو شادی کے بعد پہلی بار تنہا چھوڑ کے جا رہا ہوں میری سوچ کے برعکس وہ خاصی پر ہمت نظر آ رہی ہے اور مسلسل مجھے اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کا احساس دلا رہی ہے کل ہی میری فلا میٹ ہے اسلام آباد کی وہاں سے میں تقریباً بیس روز کے لیے جاپان روانہ ہو جاؤں گا۔“

ڈائری ختم ہو چکی تھی اور مقدس بری طرح الجھ گئی۔ ڈائری اٹھانے سے قبل اس نے اچھی طرح یہ تسلی کرائی تھی کہ یہ وہاں موجود ڈائریوں میں سے آخری لکھی گئی ڈائری تھی۔

”تو کیا ان کے جاپان جانے کے بعد کچھ ہوا تھا۔ کیا واقعی وہ سب ہوا تھا جو بی بی جان اور چچی جان کہتی ہیں کہ ممانے بابا کی عدم موجودگی میں کسی اور سے نہیں نہیں ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ یہ ڈائری پڑھنے سے قبل میں نے بھی یہ فرض کر رکھا تھا کہ واقعی میری ممانہ غیر ملکی اور غیر مسلم ہونے کی وجہ سے آزاد رہش رکھتی ہوں گی۔ حویلی کی رسموں کو انہوں نے قبول نہیں کیا ہوگا اور اپنے لیے کوئی دوسرا راستہ جن لیا ہوگا اور اسی بات پہ دل برداشتہ ہو کر بابا جان یہ ملک چھوڑ کے چلے گئے ہوں گے۔ لیکن..... یہ ڈائری تو کوئی اور کہانی سناتی ہے۔“

میرا ممانہ تو تیسرا مسلم ہیں اور نہ ہی غیر ملکی..... نہ یہودی نہ عیسائی، نہ ہی جرمن نہ فرینچ ان کا ”مومنہ“ ہونا ہی تو بابا جان کو چوڑکا گیا تھا اور انہوں نے ہر ہر صفحے پر ان کی پاکیزگی کا عقیدت بھرے انداز میں ذکر کیا ہے۔ اب تو میں میرے بھی یہ تصور نہیں کر سکتی کہ وہ کبھی بابا کو دھوکا بھی دے سکتی ہیں۔..... پھر..... پھر کیا وجہ تھی..... کیا ہوا تھا ان کی غیر موجودگی میں..... کیوں نہیں وہ واپس لوٹے.....؟

وہ سوال تھے جواب بھی باقی تھے اور ایک سوال یہ بھی۔

میرا میری یاد نے بھی انہیں واپس لوٹنے پہ مجبور نہیں کیا؟“ اسے ان آخری صفحات کے پڑھنے سے لگتا ہے کہ وہ تحریر یاد آنے لگی جو اس کے بابا جان نے اس کی پیدائش کے وقت لکھی تھی۔ اس نے ایک بار پھر صفحے پلٹے۔

۱۹۸۱ء

میں اتنا مطمئن تھا مومنہ کے ساتھ کہ مجھے کوئی کمی کبھی محسوس ہی نہ ہوتی تھی اور اب ایک ننھی سی پری نے آ کے یہ احساس دلایا ہے کہ زندگی تو ابھی ادھوری تھی۔ ابھی اک رنگ باقی تھا۔ اور میں نہیں جانتا تھا کہ یہ رنگ اتنا شوخ ہوگا۔ زندگی سے اتنا خبر پور..... جب اس نے پہلی بار اپنی بڑی بڑی آنکھیں گھما کے مجھے دیکھا..... پہلی بار میرے ہاتھوں نے اس کا نمل سانٹھا چہرہ چھوا، پہلی بار جب وہ منے منے گلابی ہونٹ بسور کر روئی۔ اور پہلی بار جب میں نے اسے سینے سے لگایا۔ میری گود میں آتے ہی وہ چپ کر گئی، جیسے روئی ہی صرف میری گود میں آنے کے لیے تھی۔

اُبھر آئیں۔ نیلم کے شفاف نکلنے سے نم ہو کے چمک رہے تھے۔ پلکوں پہ
 ٹھہرے آنسو ہیروں کی طرح جگر جگر کر رہے تھے۔ وہ مسکرا دیا۔ اچانک ان کے نقب
 سے دو اور آنکھوں نے جھانکا اور.....

”تمہاری آنکھوں کا رنگ بتاتا ہے کہ تم رورہی تھیں۔“ کسی نے ان بھوری آنکھوں
 میں پھیلے لال ڈورے دیکھ کے کہا۔ وہ ڈر گیا، خونزدہ ہو گیا۔ دونوں ہاتھ چہرے پہ چھپا کے
 چلانے لگا۔

”اسی لیے..... اسی لیے مجھے رُی لگتی ہیں یہ یادیں وہ سب بھی یاد دلا دیتی ہیں،
 جنہیں بھلانے میں اتنے سال لگے ہیں۔“

ساتھ لاتی ہے ایک ایک منظر
 یاد کچھ بھول کے نہیں آتی

☆☆☆

”کہاں جا رہے ہیں آپ اتنی صبح صبح“ خان دراب خنگ کو صبح صبح جانے کی
 تیاریوں میں مصروف دیکھ کے ان کی بیگم نے حیرت سے پوچھا۔

”ہے ان کا اتنا سویرے جاگنا اور پھر اتنے اہتمام کے ساتھ بابر ٹکنا، خلاف
 عیول جنہیں وہ بدستور اپنے کام میں مشغول رہے تو زبیدہ خانم جھنجھلا گئیں۔ جیسے ہی وہ
 ان کے چہرے پر بیگم کو راستے میں پھر موجود پایا۔

”کیا ہے؟“ وہ اپنے مخصوص اکھڑ لہجے میں بولے۔

”رپٹ آپ نہ تو اکیلے جائے ہیں نہ ہی اتنی رازداری کے ساتھ پھر.....“
 بڑے لالہ کے پاس جا رہا ہوں، اسلام آباد۔ انہوں نے کسی کام سے بھیجنا ہے مجھے۔“

”انہیں آپ سے کیا کام ہو سکتا ہے، یا یوں کہیے کہ آپ ان کا کیا کام کر سکتے ہیں
 بھلا اور پھر نہ رازداری نہ گارڈ یوں فجر سے بھی پہلے روانگی کا کیا مطلب ہے۔“ ان کی کسی

طور تسلی نہ ہوتے دیکھ کے دراب زنج ہو گئے۔

”گارڈ کے ساتھ نکلا تو لوگ متوجہ ہو جائیں گے۔ اکیلے زیادہ رازداری کے ساتھ
 پہنچوں گا۔ بڑے لالہ کی خاص ہدایات ہیں کہ ملازمین تک کو علم نہ ہو، میرے گھر سے نکلنے

کا۔ خود وہ بھی سارا دن آفس میں مصروف رہیں گے تاکہ سب کو یہ تاثر ملے کہ ہم دونوں
 بھائی سارا دن اپنے اپنے کام میں مصروف رہے ہیں اور زریاب لالہ کو۔“

”دیکھو مومنہ، دیکھو اس کا چہرہ..... بالکل تمہارے جیسے ہونٹ، وہی ناک، وہی
 رخسار، وہی پیشانی، وہی آنکھیں۔“

”نہیں، اس کی آنکھوں کا رنگ میرا نہیں ہے۔“

اس کے کہنے پہ میں نے ذرا سا گدگد کے اسے دوبارہ آنکھیں کھولنے پہ مجبور کیا۔

”ارے ہاں واقعی۔“ اس کی نیلی کانچ سی آنکھیں دیکھ کے میں نے کہا۔ وہ شاید

اس طرح کسمائے جانے پہ بردامان گئی تھی۔ پھر سے مٹھیاں بھینچ کے رونے لگی۔

”دیکھو، مومنہ! تمہاری طرح اس کے بھی رونے پر آنسو نہیں نکلتے، صرف آنکھوں کا

رنگ یہ بتاتا ہے کہ وہ رورہی ہے۔ تم بھی جب روتی ہو تو شہد کے قطروں کے گرد جیسے کوئی

روح افزا گرا جاتا ہے۔“ میری مثال پہ وہ کھلکھلا کے ہنسی۔

”اور یہ جب روتی ہے تو نیلم کے نکلنے کے گرد کوئی ہتھ کوٹ کے پھینک دیتا

ہے۔“ اس کی نیلی آنکھیں دیکھ کے میں نے کہا تھا۔

مقدس نے اپنی پلکوں کو انگلی کی پور سے چھوا وہ نم ہو گئی۔

”بابا جان دیکھیے آج بھی میرے آنسو آنکھوں میں ہی تڑپتے پھرتے ہیں۔“

☆☆☆

وہ دیوار سے سر ٹیکے اکڑوں بیٹھا تھا جب ہڑبھڑکے آنسو اس نے چونک کے
 چاروں طرف دیکھا اور پھر سے رات کے سانے میں اس آواز کو غوغا بننے کی کوشش کی مگر

بے سود..... وہ بے چین ہو کے ٹہانے لگا۔

”کیا میں نے خواب دیکھا تھا؟ لیکن خواب دیکھنے کے لیے سونا بھی تو ہوتا ہے
 میں کب سویا ہوں جو خواب دیکھا ہو..... پھر وہ آواز.....“

یادوں کی جڑیں پھوٹ بنی پڑتی ہیں کہیں

دل اگر سوکھ بھی جائے تو بنجر نہیں ہوتا

”یہ کس دراز سے اس کی یاد بھوٹ پڑی۔ میں نے تو دل کب کا پتھر کر لیا تھا۔“ وہ
 سینے مسلنے لگا جہاں دو نیلی کانچ سی آنکھیں جگمگاتی تھیں۔

”اور جب یہ روتی ہے تو نیلم کے نکلنے کے گرد کوئی ہیرے کوٹ کے پھینک دیتا
 ہے۔“ کسی نے سرگوشی کی اور تاریکی میں دو روتی بسورتی آنکھیں ہزاروں ٹکڑوں کے لیے

”کہاں ہیں زریاب لالہ؟ کب آئے وہ؟“ زبیدہ بے تابی سے اور آگے بڑھیں۔

”آہستہ زبیدہ آہستہ“ وہ ڈپٹ کے بولے۔

”ابھی نہیں آئے وہ، کل آتا ہے انہیں۔ لیکن بڑے لالہ نے اپنے ذرائع استعمال کر کے انہیں آج ہی لانے کا انتظام کر لیا ہے۔ کل دشمن گھات لگائے بیٹھے ہوں گے۔ بلکہ وہ تو کئی روز سے چوکنے ہیں اس لیے آج بھی انہیں لانے کے لیے اتنی رازداری اور احتیاط برتی جا رہی ہے۔“

”بائے اللہ۔“ وہ سینے پہ ہاتھ رکھ کے بیٹھ گئیں۔

”اب کیا ہوگا؟“

”کچھ نہیں ایک بار لالہ خیریت کے ساتھ ہو جائیگی۔ پھر کس کی حرکت ہے جو انہیں نقصان پہنچا سکے۔ آگے کے لیے بھی بڑے لالہ کو کافی کچھ سوچنا پڑے گا۔ وہ انہیں دشمنوں کی پہنچ سے دور بہت دور پہنچا دیں گے۔ یہاں تو وہ تو نہیں باچا جان کی تسلی کے لیے لارہے ہیں۔“

”اور آپ..... آپ اکیلے اتنے خطرناک کام.....“

”کوئی خطرناک کام نہیں، یہ فرض ہے میرا۔ صرف احتیاط سے کام لے رہے ہیں ہم لوگ۔ ورنہ ایسی بات نہیں کہ خنک خاندان اب ہزاروں کی طرح بٹھ جائے۔ میرا بھارت آ رہا ہے اور میں اسے بحفاظت گھر لانے کے بجائے اپنے بچاؤ کے طریقے سوچنے بیٹھ جاؤں۔ آف ہے تم غورتوں کی بزدلی پر اور خبردار.....“ وہ پھر پلٹے۔ ”خبردار! کبھی گھر کے کسی فرد کو یہ علم نہیں ہونا چاہیے۔“

”کیا کہا؟ پھر سے کہنا.....“ شادور چونک کے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”میری ماما! جیسا کہ تم لوگوں کی قیاس آرائیاں ہیں، انگلش یا جرمن نہیں، کالا ش کی رہنے والی ہیں۔ وہ اس خاندان کا حصہ نہیں لیکن اسی وطن کے ایک خوب صورت پہاڑی خطے کی رہنے والی ہیں اور وہ مسلمان بھی ہیں، پیدائشی مسلمان۔ مومنہ علی۔ مومنہ زریاب خنک۔“

اس نے دوبارہ زیادہ تفصیل سے بتایا۔ شادور کھوئی کھوئی کیفیت میں بیٹھی رہی۔ مقدس کے لیے اس کا رد عمل حیرت انگیز تھا۔ ابھی کچھ ہی دیر پہلے تو وہ اس سے پوچھ رہی

تھی کہ ڈائری سے اس کی معلومات میں کیا اضافہ ہوا تب وہ ہنس ہنس کے بتانے لگی۔

”بے حد اضافہ ہوا میری معلومات میں دیر اور چترال میں پچھلی کا شکار کرنا اور جمیلوں میں نہانا منع ہے۔ سوات کا رقبہ ۸۷۸۸ مربع کلومیٹر ہے اور آبادی بارہ لاکھ ہے۔ چترال سے ایوان کے رستے کلام میں داخل ہوا جاتا ہے، وادی بمبوریت پر داخلہ ٹیکس پندرہ روپے ہے اور.....“

”ہیں..... ہیں..... یہ کیا اول فول بک رہی ہو۔“ وہ مشتعل نظروں سے اسے گھورنے لگی۔

”اور سنوٹاں..... وہاں کی اپنی زبان میں بمبوریت کو مرمریت، برو اور بری لاکتے ہیں اور وہ جوان کارہوائی لباس ہوتا ہے ناں عورتوں کا کرتے کو۔“ پوش“ کمر کی پٹی کو“ مشوشت“ اور ٹوپی کو“ کوپسی“ کہتے ہیں اور.....“

”اشاپ ایٹ مقدس تم انہیں بتانا چاہتیں تو نہ بتاؤ۔ لیکن یہ کافرستان کا سفر نامہ تو ت ساؤ۔“ وہ باقاعدہ ناراض ہوئی۔

”جو پڑھا ہے وہی سنا رہی ہوں، ڈیئر، میری ماما بابا جان کو انہی پہاڑوں میں ملی تھیں۔“ مقدس نے مختصر تمام کہانی اسے سنا ڈالی۔

”مومنہ علی..... مومنہ زریاب..... مومنہ.....“ شادور بے یقینی سے بڑبڑا رہی تھی۔

”مومنہ علی..... مومنہ زریاب..... مومنہ.....“ شادور کے چہرے پہ

”کیا.....؟“ وہ فرط حیرت سے اچھلنے کو تھی کہ شادور نے اس کے ہاتھ تھام کے پھر سے بٹھایا۔

”آرام سے بیٹھ کے سنو۔ میں نے ایک بار تمہیں بتایا تھا ناں کہ ہمارے ہاسٹل

میں ایک ملازمہ..... میرا مطلب ہے ایک عورت ہے جس کی شکل و صورت تم سے حد درجہ

مشابہ ہے۔ تمہاری آنکھوں کی ساخت، چہرے کی بناوٹ، بالوں کی رنگت، ایک ایک نقش حتیٰ کہ آواز اور مسکراہٹ بھی بالکل ایک جیسی ہے۔ میری اس بات کو اس وقت تم نے مذاق

URDU PHOTO

میں اڑا دیا تھا خود میں بھی اسے زیادہ سیرسلی نہیں لے رہی تھی اس لیے بھول بھال گئی۔ اب تم نے جو بات بتائی ہے تو رہ رہ کے وہی چہرہ میری نگاہوں میں آ رہا ہے وہی شہد رنگت آنکھیں، سر و قد، وہی رخسار اور ٹھوڑی پہ گودے تل اور نام، اس کا نام بھی مومنہ ہی ہے۔ ہم سب انہیں اماں مومنہ کہتے ہیں۔“

”کیا واقعی؟ پھر تو وہ..... کیا پتہ وہی...“ اس کے لبوں سے لفظ ٹوٹ ٹوٹ کے نکل رہے تھے۔

”ہاں شاید وہی..... اور شاید وہ نہ ہوں۔ تم ہر بات کے لیے خود کو تیار رکھو۔“ شناور نے اس کے کپکپاتے وجود کو سہلایا۔

”میں اسی لیے یہ بات تمہیں بتانے میں ہچکچاہتی تھی۔ میں یہ تو نہیں جانتی تھی کہ کیلاش کی ہیں یا نہیں لیکن پٹھان ہیں یہ بات سب ہی جانتے ہیں۔ بارہا اس وقت اردو بولنے کے باوجود کہیں کہیں پشتو لب و لہجہ چھلکے اُڑ جاتا ہے اور ان کی شکل و صورت سب انہیں پٹھان ہی ظاہر کرتے ہیں۔ خصوصاً چہرے پہ گودے تل جو مونا سرحد کی پہاڑی دو شیراؤں کی نشانی ہیں۔ اسی لیے تمہارے ذکر کرتے ہی میرے تصور میں فوراً ان کا ہی چہرہ آیا۔ لیکن پتہ نہیں میں نے تمہیں بتا کے صحیح کیا یا غلط۔ میرا مطلب ہے ابھی یہ بات کنفرم تو نہیں ہے ناں یہ نام ایک ہی شخصیت کا تو نہیں ہو سکتا۔“

”نہیں شانو نہیں۔ تم ان کا ذکر کرتی ہو تو میرا دل تمہارے اک اک لفظ پہ ایمان لانے کو چاہتا ہے۔ یہ دل کہتا ہے شانو کہ وہی ماما ہیں وہی میری ماما ہیں۔“ وہ مضبوط لہجے میں بولی۔

URDU PHOTO

”مگر وہ نشان..... میں نے تمہیں بتایا تھا ناں۔“

ہیں۔ ایک طرف کا رخسار اور آنکھ کا نچلا حصہ پورا جلا ہوا ہے۔“

”جو بھی ہو۔ میں جلد از جلد ان سے ملنا چاہتی ہوں۔ تم ابھی اور اسی وقت میرے ساتھ لاہور چلنے کی تیاری کرو۔“

”ابھی..... اسی وقت..... مگر کیسے؟“ شناور بولی۔

”ابھی کل ہی دراب ماموں نے پوچھا تھا کہ وہ کب ہماری واپسی کی تکلیف بنوائیں۔ تو میں نے انہیں اگلے ہفتے کسی بھی دن کی تکلیف بک کروانے کے لیے کہا تھا۔ ابھی تقریباً بارہ چھٹیاں باقی ہیں۔“

”لیکن میں ایک ہفتہ نہیں رک سکتی۔ مجھے آج نہیں تو کل ضرور لاہور جانا ہے۔“

”اتنی جلدی تکلیف کیسے ملیں گی محترمہ۔“

”بائی روڈ چلے جائیں گے۔“ وہ مسرت تھی۔

”بائی روڈ؟ پورے آٹھ گھنٹے کا سفر۔ نا بابانا۔“ اس نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔

”پلیز شانو..... پلیز..... تم میرے لیے اتنا بھی نہیں کر سکتیں۔“ وہ منتوں پر اتر آئی۔

”میں تمہارے لیے بہت کچھ کر سکتی ہوں، مقدس لیکن تم خود سوچو محض میرے ہائی بھر لینے سے تم لاہور تو نہیں پہنچ جاؤ گی۔ بی بی جان کبھی ہمیں بائی روڈ اکیلے جانے کی اجازت نہیں دیں گی اور سب سے بڑی بات یہ کہ ہم اپنے ہنگامی فیصلے کا ریزن کیا دیں گے۔“

”تمہاری ہر بات مان لیتی ہیں۔ تم ان سے بات کر کے تو دیکھو۔ کوئی بھی بہانہ بنا لو پلیز۔“

”اچھا بابا!“ اس کے مسلسل اصرار پہ وہ بارہا ان کے بی بی جان کے پاس چلی آئی۔

”بی بی جان اور کیا وجہ ہونی ہے دراصل میں نے اور میری دوسری فرینڈز نے جس ایگزیشن میرا مطلب ہے تصویری مقابلے میں حصہ لینا تھا اس کی ڈیٹ یعنی تاریخ مقرر ہو گئی اور ابھی ابھی شائستہ کا فون آیا تھا مجھے جلد از جلد وہاں پہنچنا ہے تاکہ اپنا نام لکھوا سکوں۔ میں اس مقابلے میں شامل ہونے سے رہ جاؤں گی۔ آپ پلیز ہمیں ڈرائیور کے ساتھ لے جائیں۔ میرا مطلب ہے مقدس بھی میرے ساتھ ہی چلی جائے اس کی بھی چھٹیاں ہیں۔“

”اکیلے سفر نہیں کئے گا۔“

”جائی گا۔ اس کا بچا ایک دم بوگس اور فضول ہے، پھر بھی وہ بڑے دھڑلے سے بول رہا ہے۔“

مقابلے بی بی جان بھی اس کے کالج کا پتا معلوم تھا نہ تعلیم کی خبر۔

انہیں کیا علم کہ ایسے مقابلے یوں ہی منعقد نہیں ہوتے اور نہ ہی اسکول میں ہونے والے ٹیبلو پروگراموں کی طرح ان میں لائن میں لگ کے نام لکھوانا پڑتا ہے۔ پھر بھی وہ پڑھتیں نہیں تھی کہ بی بی جان بھلے اس کی بات کا اعتبار کر لیں لیکن ضروری نہیں کہ اکیسے جانے کی اجازت بھی دے دیں۔ اور اس وقت وہ حیران رہ گئی جب بی بی جان نے بغیر کسی سوال کے کہہ دیا۔

”تم تیاری کرو۔ اگر ہو سکے تو نوبے تک ڈرائیور کے ساتھ نکل جاؤ شام تک پہنچ جاؤ گی ورنہ تیاری میں، یہ ہونے کی صورت میں کل صبح سفر کرنا۔ میں نہیں چاہتی تم دوپہر کو نکلو اور

رات گئے ہاسٹل پہنچو۔“

”تھینک یو بی بی جان! ابھی نو بجنے میں پورا سوا گھنٹہ ہے۔ ہم تقریباً تیار ہی ہیں۔ آپ ڈرائیور کو کہلوادیتے،“ وہ بھاگتی ہوئی مقدس کو خبر سنانے کمرے سے نکلی اور بی بی جان نے سینے میں کب سے رکھا ساٹس خارج کیا۔

”اچھا ہوا مقدس کے یہاں سے جانے کا سبب بن گیا۔ ورنہ زریاب کے یہاں آتے ہی پھر سے..... اچھا ہی ہوا جو آتے ہی اسے یہ صورت دیکھنے کو نہ ملے گی ورنہ.....“

☆☆☆

”لالہ.....“ دراب نے بے تابی سے آگے بڑھ کے اسے گلے سے لگا لیا۔

”دراب تم؟“ وہ حیران تھا۔ اس قید تہائی میں کسی اسے کی موجودگی؟

ازیت و کرب کے تھپڑ سبتے وجود کو کسی کی میریاں بانٹوں (سارا)۔

اس نے حیرت سے خود کو اس کی بانہوں کی گہرے جوش لہناہل جوس کیا۔

”تم یہاں کیسے؟“

”آپ کو لینے آیا ہوں لالہ.....“

”مجھے لینے؟ کیا اتنا وقت بیت گیا۔“ وہ حیران تھا کہاں تو سرخ شیخ کے بھی ایک

رات نہ گزرتی تھی۔ کانٹوں پہ چل چل کے ایک ایک پہر تپا تھا اور اب یہ کہہ رہا ہے.....

”چلیں..... لالہ، گھر چلیں۔“ اس نے بھائی کا ہاتھ تمام کے آگے بڑھنا چاہا۔

”گھر؟ چلو۔“ وہ یوں بولا جیسے اس کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہ ہو۔

وہ بن ہو کے صحرا، دیوانے کو کہنے لگا۔

زنجیر کھلی ہو تو پھر خاک اڑانا ہے

اور خان زریاب خٹک برسوں بعد گندی بوسیدہ دیواروں، پیر زخمی کرتی بیڑیوں اور

سنگاخ پتھروں والی زمین کی سنگت چھوڑ کے آزاد فضا میں آ گیا۔ باہر نکلتے ہی اس نے

پہچے مڑ کے دیکھا۔

”سینٹرل جیل پشاور۔“ کی تمام ترازیتیں، تہائیاں پیچھے رہ گئی تھیں۔ سامنے کی

آزاد دنیا میں اس کے لیے اور بھی کچھ تھی..... کچھ اور امتحان..... کچھ اور اذیتیں..

☆☆☆

عمران نکلیاں یہاں پار

ہالے نہ وہ او کالیا

عمران نکلیاں یہاں پار

”یہاں بھی ڈھنگ کا کوئی گانا نہیں لگ رہا۔“

وہ پوری طرح سے اسد امانت علی خان کی پُرسوز آواز میں کھوئی ہوئی تھی جب شادور

نے ایف ایم ون ہنڈرڈ بھی آف کر دیا۔

”کسی ایک جگہ تو تک جاؤ۔“ مقدس کو اس طرح اس کی مداخلت پہ اچھی خاصی

کوفت ہوئی۔

”میرا بالکل دل نہیں لگ رہا ان اجازت سنان سڑکوں پہ تم بھی منہ لپٹے بیٹھی ہو۔

پیننگ بھی اس قدر افراتفری میں کی کہ کیسٹس بھی لانا بھول گئی۔ آف کس طرح کئے گا.....

یہ سفر، ابھی پورے ساڑھے چار گھنٹے باقی ہیں۔“ اس نے باقاعدہ واویلا مچا دیا۔

”تو کوئی رسالہ ہی پڑھ مرلو۔“ اس نے سائیڈ پہ رکھے بیگ میں سے اکٹھے دو تین

ڈائجسٹ نکال کے اس پہ پھینکے۔

”یا پھر کچھ دیر سونے کی کوشش کرو میرا دماغ مت چاٹو۔“ وہ اس وقت واقعی بے حد

ایکجائی تھی، اسی لیے اس لہجے میں اس سے بات کر گئی، ورنہ شادور کی طبیعت کا بے صبرا

یہاں اس لیے نئی چیز نہیں تھی۔ وہ بھی مقدس کی ذہنی کیفیت بھانپ کر چپ کر گئی لیکن نچلا

نہیں تھا۔ کچھ دیر بھی کہاں تھا۔ چند منٹ منہ پھلا کے بیٹھنے کے بعد وہ ڈرائیور سے

”یہ کیا ہے ماما، اس قدر کواں کیسٹ رکھے ہوئے ہیں تم نے، نام بھی اتنے

ہولناک ہیں۔“ پینتوپہ زہ کسٹم۔“ اور یہ کیا ہے ”شرنگ دا بنگلہ۔“ مائی گاڈ کیا تصویر بنی

ہے اس کے کور پہ نام ہے۔“ خونڑے۔“

”وہ دو مجھے۔ سرہ لو پٹہ۔“

”واللہ کیا ظالم ظالم گانا ہے اس میں۔“ اس نے سر ڈھنتے ہوئے کیسٹ طلب کیا۔

”رہنے دو ماما! ہمیں نہیں یہ ظلم سہنا۔ اگر پشتو گانا سننا ہی ہیں تو بندہ رحیم شاہ یا پھر

سردار نگر کو سننے کیوں مقدس۔؟“ اسے آنکھیں موندے دیکھ کر وہ مایوس سی ہوئی۔“ اب

کس سے سر پھوڑوں۔“ ایک آدھ سیکنڈ ہی خاموش بیٹھے رہنے کے بعد وہ پھر آگے کی

طرف جھکی۔

”اس سے تو اچھا ہے ایف ایم ون بندر ڈی نکالوں۔ غزلیں اور کافیاں ہی سہی۔“
گاڑی میں پھر سے وہی ہر درد لے مدھم مدھم سی ابھرنے لگی۔

کدے نہ سکھ سنبھا کہلیا

کدے نہ

ہائے کدے نہ

”خانہ خراب“ ایک جھٹکے سے گاڑی کے زکنے پہ اور نگزیب ماما جھنجھایا ہوا سا باہر

نکلا۔

”کیا ہوا؟“ وہ دونوں بھی متفکر ہو گئیں۔

”نائر پچھو گیا ہے جی بی!“ وہ چیک کرنے کے بعد پیچھے کی طرف مڑا۔

”چلو، کوئی بات نہیں۔ زیادہ سے زیادہ کی سہارا منٹ نہیں کئے تاکہ جان ہونے

میں۔“ ان دونوں نے ایک دوسرے کو تسلی دی۔

”اوائے خانہ خراب کا بچہ۔ کسی جرسی کی اولاد پھر دہا دے گیا۔“

”اب کیا ہوا؟“ وہ دونوں بیک وقت ششے نیچے کر کے باہر سر نکالتے ہوئے

چلائیں۔

”وہ خبیث رمضانی نہیں ہے، اس کو میں بولا بھی تھا گاڑی چیک کرنے کے واسطے،

یہ چیک کیا ہے اس خانہ خراب نے؟ پھالتو (فالتو) نائر مائر بھی نہیں رہی۔“

”تمہاری تو پرانی عادت ہے ماما۔ اپنی غلطی دوسروں کے سر تھونے کی، پورا تمہیں

ڈرائیو کرنی تھی، تمہیں خود سب انتظام کرنا چاہیے تھا۔ وہ بچہ تو رانا تھا۔“

ہوا ہے؟“ شناور کے ڈپٹے پہ وہ چپ چاپ سر جھکائے کھڑا رہا۔

”ظالم ظالم گانوں والے یہ الم غلم کیسٹ بھرنے یاد تھے، ایک اسپئر نائر نہیں رکھ سکتے

تھے۔“

”اب بس بھی کرو۔ یوں سر راہ چلانے سے کچھ ہو جائے گا کیا؟“

مقدس نے ناگواری سے اسے دیکھا جو کمر پہ لڑاکا عورتوں کی طرف ہاتھ جما کے بازو

نچاتے ہوئے اور نگزیب کی خبر لے رہی تھی۔ آس پاس سے گزرتی گاڑیاں کچھ دیر کے

لیے آہستہ ہو جاتی تھیں ان کے قریب سے گزرتے ہوئے۔ مقدس کو بھی نکر تو ضرور تھی

لیکن اس طرح سڑک پہ تماشا بن جانے کا خوف زیادہ تھا۔ وہ پھر سے آوازیں دے کے
اسے گاڑی میں بیٹھنے کے لیے بلانے لگی۔ ایک سلور گرے کروڈا کی اسپید بھی سلو ہو گئی ان
کے پاس آتے ہی، مگر دوسرے لوگوں کی طرح گردن باہر نکال کے محض صورت حال کا
جائزہ لے کر گاڑی آگے بڑھالے جانے کے بجائے اس شخص نے ان سے ذرا آگے
سائیڈ پہ کار پارک کی اور خود ان کی طرف بڑھ آیا۔

”اپنی برا بلیم؟“ بے حد شائستہ انداز میں اس نے شناور سے پوچھا۔ جو غنتے سے

تمتھایا چہرہ لیے تسلسل ڈرائیور کو گھور رہی تھی۔ غصے کی زیادتی نے اسے ڈھنگ سے اس

اجنبی کی بات کا جواب بھی نہیں دینے دیا۔ وہ شخص بڑبڑا کے رہ گئی۔

”وہ نائر پچھو گیا ہے تمہیں اور پھالتو نائر بھی نہیں۔“ اور نگزیب منمنایا۔

”اوائے آپ پریشان مت ہوں مس۔ اپنی لیٹ پہ آرام سے بیٹھیے جا کر، میں نائر

دے دیتا ہوں آپ کے ڈرائیور کو۔“ وہ گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ پیچھے پیچھے باجیس پھیلاتا

ہوا اور نگزیب بھی لپکا۔

”ماما ایک منٹ“ مقدس نے پرس میں سے کچھ روپے نکالے۔ ”شناور یہ ماما کو پکڑا

دو۔“ کی قیمت ادا کر کے پھر لیں۔“

”اے کیسی زمی مس! یہ آپ نے بھجوائے ہیں؟“ وہ نوٹ لہراتا پھر شناور کے سر پہ

جوڈ تھانے میں نائروں کی خرید و فروخت کا کام بالکل بھی نہیں کرتا۔ بائی پروفیشن، میں

کے لیے نائروں کو نائر خریدتا ہی ہے تو میں آپ کے ڈرائیور کو چند میل آگے

میں نائروں پہ ڈرائیور کر دیتا ہوں۔ لیکن یہ سوچئے کہ آپ کا یوں تنہا اس کے انتظار

کے لیے ہو، مناسب ہوگا؟ یہی ہے کہ آپ یہ نائر لے لیں پلیز۔“

”دیکھیے ہم لوگ اس وقت آپ کی مدد لینے پہ مجبور ہیں، لیکن پھر بھی بغیر قیمت

اواکے یہ نائر لینا بھی ہمیں گوارا نہیں۔“ مقدس باہر نکل آئی۔ اسے دیکھ کے وہ یوں چونکا

جیسے گاڑی میں اس کی موجودگی سے بے خبر ہو۔

”اس طرح آپ کا یہ عمل مدد نہیں احسان کہلائے گا اور کسی کا احسان لینا ہماری

روایات کا حصہ نہیں۔“

اس کے مضبوط لہجے اور ہر اعتماد انداز سے ملاحظہ ہو کے وہ مسکرایا۔

”اور خواتین کی مدد کرنے کا معاوضہ وصول کرنا ہماری روایات کا حصہ نہیں۔ بہر حال

آپ کے اصول بھی مقدم ہیں ہمیں۔ آپ یوں کیجئے یہ میرا کارڈ رکھ لیں اور جب آپ کا مسئلہ حل ہو جائے میرا ٹائر مجھے واپس لوٹا دیجئے گا۔ شکرے کے ساتھ۔“ وہ اس کی ٹیلی آنکھوں کی انجمن محسوس کر کے مسکرایا۔

”نہیں خیر، شکر یہ تو ہمیں ابھی بھی آپ کا ادا کرنا چاہیے۔“ شادور کو آداب یاد آگئے۔

”اوائے خانہ خراب۔“ اور نگزیب نے پھر وہائی دی۔ ”یہ تو دو ٹائر چکر پڑے ہیں۔“

”اوہ نو!“ ان تینوں کے منہ سے افسوس بھرے انداز میں ادا ہوا۔ مقدس تو مایوس سی ہو کر دوبارہ سے گاڑی میں بیٹھ گئی، جب کہ شادور ذرا آگے ہو کے گزرتی گاڑیوں کو اُمید بھرے انداز میں دیکھنے لگی کہ شاید کوئی اللہ کا بندہ مزید ایک ٹائر دینے کے لیے آجے۔

”بی بی۔“ اور نگزیب تیزی سے اس کی طرف دیکھا۔ ”اس کے دو ٹائر لے پہ وہ ہم کو مقدس کی طرف بڑھا۔“

”بی بی تم ہی سن لو امارا بات۔“

”ہاں بولو۔“ موڈ تو اس کا بھی خاصا خراب تھا لیکن غصے کی بجائے اب کیا مژدہ سنا رہا ہے، ماما اور نگزیب خان۔ شادور بھی سن گن لینے پاس کھڑی ہوئی۔

”وہ ڈاکٹر صاحب (ڈاکٹر صاحب) کہتا ہے کہ ام تینوں اس کی گاڑی میں بیٹھیں۔“ وہ آگے کوئی ہوٹل موٹل ہے وہاں تک چھوڑ دیے گا۔ بی بی لوگ آرام سے بیٹھ آئے اور (ادھر) چائے مائے پیے گا اور ام ٹائر لے کے واپس یہاں آئے گا۔

اور لینے آئے گا۔“ اس نے پانچ نکاتی منصوبہ تفصیل سے دہرایا۔

”چلو یہ مسئلہ تو حل ہوا۔“ شادور نے سکون بھری سانس لی۔

”لیکن ہم کیسے کلمی اجنبی کے ساتھ چل پڑیں۔“ مقدس کو اعتراض تھا۔

”بی بی کوئی پندرہ منٹ لگیں گے، بس ہوٹل تک جانے میں اور پھر ام ہے ناں تمہارے ساتھ۔“ اس نے تسلی دی۔

”میرا خیال ہے مقدس یہی بہتر ہے۔ یہاں اکیلے موٹر دے پہ کھڑا ہونا بھی تو ناممکن سی بات ہے۔“ اس کے کہنے پہ وہ مزید پس و پیش کرنے کے بجائے اپنا شو لڈر بیک

اٹھائے چادر درست کرتی باہر نکل آئی۔

”بی بی تم لوگ بھکر (فکر) مت کرو۔ ڈاکٹر صاحب شریف آدمی ہے اور پختو (پشتو) بھی بولتا ہے۔“

وہ پختو بولتا ہے یا نہیں یہ تو پتا نہیں چل سکا۔ اتنا اندازہ ضرور ہو گیا ان دونوں کو کہ ڈاکٹر صاحب واقعی شریف بندہ ہے۔ بارہ منٹ کی ڈرائیو میں اس نے بالکل بھی دونوں لڑکیوں کو مخاطب نہ کیا، البتہ کافی شاپ میں اس کی دی گئی کافی اور اسٹینکس کی پیش کش شکرے کے ساتھ واپس لوٹا دینے پہ وہ چپ نہ رہ سکا۔

”یہ تو آپ میری مہمان نوازی کو ٹھیس پہنچا رہی ہیں محترمہ!“

”کوئی آپ کے گھر تھوڑا ہی بیٹھے ہیں۔“

”میرا فرض ہے“ اس کے پاس بھی جواب حاضر تھا۔

”معاذ کیجئے گا، آپ کی مدد اور تعاون کے لیے ہم واقعی شکر گزار ہیں، لیکن یہ ہماری بھاری بھاری تھی ورنہ جس خاندان سے ہمارا تعلق ہے وہاں لڑکیاں اجنبیوں سے تواضع نہیں کرتیں۔“ اب کی بار مقدس اپنے مخصوص سنجیدہ اور دو ٹوک انداز میں بولی تو وہ مسکرایا جیسے اب تک کی بلا مقصد بحث محض اسے بولنے پر اُکسانے کی

بجائے مایا آپ نے۔ اجنبیوں سے گریزا تھی بچیوں کا شیوہ ہے لیکن...“ وہ لطف سے مقدس کی برہمی کا۔ اگر وہ واقعی اجنبی ہو تو.....“

مقدس سر ابل گئی اس کے نعرے پہ، اس نے پہلی بار نظر اٹھا کے سامنے بیٹھے خوش قامت و خوش لباس شخص کو بغور دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں استفسار پڑھ کے وہ مسکرایا۔

”آپ کے بیک میں میرا کارڈ موجود ہے۔ اس لحاظ سے تو آپ کو مجھے اجنبی نہیں کہنا چاہیے۔“ مقدس کا دایاں ہاتھ بے ساختہ اپنے بیک کی طرف سرک گیا۔ اسے یاد آیا بے دھیانی میں اس نے یہ کارڈ بغیر دیکھے ہی بیک کے اندر ڈال لیا تھا۔ وہ بھی شاید اس کی بے اعتنائی جان چکا تھا اس لیے اپنا باقاعدہ تعارف کروانے لگا۔

”مجھے ڈاکٹر خوشنود کہتے ہیں۔ ایوب میڈیکل کالج ایبٹ آباد میں اعزازی طور پر
 تعینات ہوں۔ اس کے علاوہ اسلام آباد میں اپنا ایک ذاتی کلینک بنانے کا ارادہ ہے۔ آج
 کل اسی کے سلسلے میں کچھ مصروفیات ہیں۔ لاہور میں ایک ذاتی نوعیت کے کام سے جا رہا
 ہوں۔ آپ لوگ بھی شاید لاہور ہی جا رہی ہیں۔“ ان کا تعارف لینے کے بجائے اس نے
 سرسری سا ایک سوال کیا اور اثبات میں جواب ملنے پر خاموشی سے کافی پینے لگا۔ اگرچہ اس
 نے دوبارہ ان سے اصرار نہیں کیا تھا لیکن اس طرح اکڑ کر بیٹھے رہنا کم از کم شناور سے گوارا
 نہیں ہوا اور اس نے بھی اپنا گ اٹھا لیا۔ مقدس نے ایک نظر سامنے بیٹھے اس نفیس طبع شخص
 کو دیکھا جو اس وقت گرد و پیش سے لاپرواہ نظر آتا ہوا کافی اور اخبار سے شغل فرما رہا تھا اور
 جس نے تکلفاً بھی ایک بار اپنے سامنے بیٹھی نظر کیوں کا تاہم یہ نہیں جانتا جا رہا تھا۔ اس نے
 ہاتھ خود بخود اپنے سامنے رکھے بھاپ اڑاتے گ کی طرف سے کچھ بے چینی سے
 اور تیزی سے آتا نظر آیا۔

”گاڑی آ گیا ہے بی بی! وہ جن بس والوں کے ہم کھت دیا تھا ابوں نے نائر
 بدلنے میں بھی مدد کر دیا اسی لیے ام جلدی واپس آ گیا۔
 ”شکر ہے اللہ کا۔“ دونوں جلدی جلدی اپنے بیگ اور پرس سنبھالنے لگیں۔
 ”آج زندگی میں پہلی بار میں نے اورنگزیب مانا کی صورت دیکھنے کے بعد شکر کا کلمہ
 پڑھا ہے۔“ شناور اس کے کان میں کھس کر بولی تو باوجود اس شکر سناؤ کے بھی وہ مسکرا کر
 خوشنود نے دلچسپی سے سر کی گرم شال کے ہالے میں لپٹے اس صبح چہرے پہ چھوٹی
 مسکراہٹ کی کرن دیکھی۔

”جئے اُس کے؟“ (چائے پیو گے) اس کی آفر
 چاہتا تھا، لیکن شناور کی گھوڑیوں سے گھبرا کے نفی میں سر ہلاتا ہوا بیک اٹھائے گا۔ خوشنود
 ایک طرف بڑھ گیا۔ کچھ دیر بعد جب وہ گاڑی میں بیٹھ رہی تھیں اسے ہاتھ میں ڈسپوز
 ایبل کپ پکڑے اس طرف آتے دیکھا اس نے زبردستی اورنگزیب کو چائے پکڑائی۔
 شناور کے دوبارہ شکر یہ ادا کرنے پہ بھی مقدس چاہنے کے باوجود اسے تھینک یونٹ نہ کہہ
 سکی۔

☆☆☆

”کون؟ وہ پٹھانی؟“ ان کے پوچھنے پہ ہاشل وارڈن نے سوال کیا۔

”جی میڈم وہی، کیا آپ بتا سکیں گی اس وقت وہ کہاں ملیں گی؟“
 ”تم لوگوں کو اس سے کیا کام ہے؟“ انہوں نے الٹا تفتیش شروع کر دی۔
 ”کتنی بار تم لڑکیوں کو تائید کی ہے کہ اسٹاف کے ساتھ اس قسم کی عنایتیں وغیرہ مت
 کیا کرو۔ یقیناً تم نے اسے کچھ رقم ادھار دی ہوگی اور اب وہ تمہارے ہاتھ نہیں لگ رہی۔“
 ”نو میڈم ایسی بات نہیں۔ ان سے کچھ اور کام تھا مجھے۔“ شناور ان کی مسلسل جھت پہ
 زبج ہو گئی۔

”آپ پلیز نہیں بلو ادیں یا مجھے بتادیں وہ اس وقت کہاں ہوں گی۔“
 ”وہ تو پچھلے ایک ہفتے سے غیر حاضر ہے۔ پرسوں اطلاع ملی تھی کہ کچھ بیمارہ غیرہ
 ہے، شاید کسی ہاسپٹل میں ایڈمٹ ہے۔ مجھے کچھ صحیح علم نہیں ہے۔“ وہ گول مول جواب
 دینے کے ٹال مٹول پہ کوئی نمبر پیش کرنے لگیں۔
 ”یوں سے ہاسپٹل آئیں؟ کیا ہوا ہے انہیں؟“ مقدس جواب تک خاموشی سے کھڑی
 دونوں کے چہرے بازی بازی تک رہی تھی، بے صبری سے کہہ اٹھی۔ وارڈن نے ناگواری
 سے اسے دیکھا اور ماؤتھ پیس بہ ہاتھ رکھ کے بولیں۔

”میں نے کہا نا، مجھے علم نہیں تمام ملازمین کی مزاج پرسی اور عیادت میری ڈیوٹی
 میں نہیں ہے۔ ہاں عرفانہ..... کیسی ہیں آپ، ایک کام کہا تھا آپ سے.....“ وہ
 کچھ کھلم کھلا طور پر فون پہ متوجہ ہو گئیں جو اس بات کا اشارہ تھا کہ اب وہ کسی اور سوال
 پر توجہ دینا چاہتی ہیں۔ شناور نے شانے اچکا کے خود پہ ضبط کرتی مقدس کو دیکھا
 اور اسے ہاتھ حاکم کے باہر نکلنے کا اشارہ کیا۔

”ایک منٹ ٹھہرو“ وارڈن کی آواز پہ وہ چونک کر مڑیں۔ ”اماں برکتے..... یہاں
 آنا۔“ ذرا ان لڑکیوں کے ساتھ باہر جا کر بات کر لو اور ہاں شناور یہ اماں اس پٹھانی کے
 ساتھ ہی رہتی ہیں۔ اس سے پوچھ لو جو بھی پوچھنا ہے۔“ بڑی عجلت میں انہوں نے
 ریسیور کان سے لگائے ہوئے، معاملہ بھگتایا۔

”کی گل اے کڑیے۔“ اماں برکتے شناور کو جانتی تھیں اس لیے براہ راست اس سے
 سوال کیا۔ وہ تینوں اس وقت خنک اور قدرے تاریک کوریڈور سے کزر کر بیرونی
 دروازے کے ساتھ بنے احاطے میں کھڑی تھیں۔ چمک دار دھوپ نے ایک دم سے
 سامنے آ کر آنکھوں کو چندھیادیا تھا۔

”اماں وہ جو بچن میں ایک خوبصورت سی گوری چٹی اماں ہوتی ہیں، اماں مومنہ، وہ کہاں ملیں گی اس وقت؟“

”کیوں؟ تمہیں کیا کام ہے؟“ اُف پھر وہی سوال۔

”کام ہے تو پوچھ رہے ہیں ناں“

”اوہ تاں بیمار ابے..... (وہ تو بیمار ہے)

”کیا ہوا ہے انہیں؟“ مقدس کو بس اُن دیکھی عورت کی بیماری بے چین کر رہی تھی۔

”ایہہ.....“ (یہ.....؟) اماں برکتے نے آنکھوں پہ ہاتھ کا چھجا بنا کر اسے بغور

دیکھا۔ اس کی سخت مزاج آنکھوں میں تعجب کے رنگ واضح نظر آنے لگے۔ شاید اسے اسے پھر اپنی جانب متوجہ کیا۔

”کیا کسی ہاسپٹل میں ہے؟“

”میں نہیں پتہ۔“ وہ یکا یک واپس مڑنے لگی۔

”ایک منٹ اماں..... رکیں تو سہی.....“ وہ رک گئی لیکن شادور کے مقابل کھڑے

ہونے کے باوجود اس کی آنکھیں بار بار مقدس کے پریشان اور الجھے ہوئے وجود پر جھٹک جاتی تھیں۔

”آپ دونوں ایک ہی کوارٹر میں رہتی ہیں۔ کئی سالوں سے ایک ساتھ ہیں۔ یہ

کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ ان کے بارے میں بالکل بھی کوئی خبر نہ رکھتی ہوں، کہ وہ کہاں ہیں، کس حال میں ہیں۔“ شادور کے جرح کے انداز پہ اماں برکتے بڑھ گئیں۔

”اپنا کام کر کڑیے۔ تیرا کی مطلب پٹھانی سے وہ کدرے کدریں گے پتھے کیا؟“

”اماں ناراض مت ہو۔ دراصل دو سال سے انہیں دیکھتی آرہی ہوں۔ پتھے ہاسپٹل

میں رہنے والی لڑکیوں کے لیے تو آپ اور دیگر لوگ ہی گھر کے افراد جیسے ہوتے ہیں ناں۔“ وہ چالپوسی پہ اتر آئی۔

”بس، ان کی بیماری کا سنا تو پریشانی سی ہوئی۔ آپ سے اس لیے پوچھ رہی ہوں کہ

شاید انہیں کسی مدد کی ضرورت ہو۔ آخر انسان ہی انسان کے کام آتا ہے۔ اگر آپ بتادیں کہ وہ تر ہاسپٹل میں ہیں تو میں انہیں دیکھ بھی آؤں گی اور علاج معالجہ وغیرہ کے سلسلے

میں کچھ مدد بھی کر دوں گی۔ بس اتنی سی بات ہے۔“ اس کے چہرے پہ پھیلی کمال معصومیت اور لہجے کی انتہا درجے کی مٹھاس شاید اماں برکتے کو موم کر دیتی، لیکن سامنے کھڑی مقدس کا

مشکر چہرہ اور مضطرب انداز میں چپٹی انگلیاں باور کر رہی تھیں کہ بات اتنی سی نہیں۔

”میںیوں سچی نہیں پتا، اوہ کیسے نوں وسدی دی نہیں سی اپنی کوئی گل۔ پر میرا خیال

اے اوہ ہن واپس آن نہیں جے گی۔ ہورے اپنے پنڈ چلی گئی ہوئے۔“ (مجھے واقعی نہیں

پتا، وہ کسی کو بتاتی بھی نہیں تھی، اپنی کوئی بات۔ لیکن میرا خیال ہے وہ اب واپس نہیں آنے

والی۔ شاید اپنے گاؤں چلی گئی ہو) وہ تیز تیز قدموں سے واپس اندر کی طرف چلی گئی۔

”کیا کبہ رہی تھیں؟“ اسے ایک لفظ نہ پلے پڑا۔

”شاید وہ واقعی نہیں جانتیں۔“

”نہیں شانو، انہیں سب پتا ہے، صاف نظر آ رہا ہے کہ وہ کچھ چھپانے کی کوشش

کر رہی ہیں۔ لیکن تو شانو کو بھی پتا تھا لیکن اس نے اس کی تائید کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

”اگر پتا ہوتا تو پتھے اور وہ ہم سے کیوں چھپاتیں۔“ وہ ہر صورت اس کا دھیان بنانا

چاہتی تھی۔ لیکن اس کی سوئی بار بار باواں برکتے کی کھوجتی نظروں پہ انگی ہوئی تھی۔

”پھر وہ مجھے یوں کیوں دیکھ رہی تھیں۔ مجھ پہ نظر پڑتے ہی ان کے چہرے کے

تاثرات دل سے گئے تھے، شانو کبہ رہی تھیں ناں کہ میرے اور ان کے چہرے میں

بڑے بڑے مشابہت ہے۔ کیا اس لیے؟“

”ہو سکتا ہے..... لیکن اس مشابہت کو بہت کم لوگ محسوس کر سکتے ہیں، خصوصاً وہ جو

تمہیں یا ان خاتون کو بہت قریب سے دیکھ جانتے ہوں۔ جب میں نے پہلی بار انہیں دیکھا تو

اس چہرے کے نین نقش مجھے چونکا گئے تھے کیونکہ برسوں سے ان نقوش سے میری واقفیت

رہی ہے۔ اسی طرح چونکہ اماں برکتے، اماں مومنہ کے ساتھ گزشتہ کئی سالوں سے رہتی چلی

آ رہی ہیں اس لیے تمہاری صورت دیکھ کے انہیں اچھنچا تو ہوا ہی ہوگا۔ ورنہ سرسری سا

دیکھنے پہ یہ مشابہت یوں محسوس نہیں ہوتی کہ ایک تو عمر کا فرق، دوسرے ان کے چہرے کا

ایک ننبالی حصہ خاصا جٹا ہوا ہے۔“

”اور..... اور..... یہ چہرہ کس نے جلایا ہوگا؟“ اس نے جیسے ہواؤں سے سرگوشی کی

تھی۔

”پلیز مقدس۔ ان سوالوں میں خود کو مت الجھاؤ۔ میں تم سے پہلے بھی کہہ چکی

ہوں کہ ہم یہاں ایک امید لے کے آئے ہیں۔ الجھے ہوئے دھاگے کا ایک سراڈھونڈنے

لیکن جب تک کوئی بات واضح نہ ہو جائے تم یہ فرض کر کے مت بیٹھ جاؤ کہ وہی تمہاری ماما

ہیں۔“ اسے تابعداری سے سر بلاتے دیکھ کے اسے ذرا تسلی ہوئی۔

”اور ہاں اکیلے مت جانا ہاسٹل، مجھے لائبریری میں بس دس منٹ کا کام ہے۔ میں فارغ ہو کے آتی ہوں تو اکٹھے ہی نکلتے ہیں۔ تمہیں وہاں چھوڑ کے میں زارا کی طرف جاؤں گی۔ اس کے ساتھ ایگزیشن کے کچھ معاملے نمٹانے ہیں۔“

اسے آڈیو ریم کی سنسان سیڑھیوں پہ گم صم بیٹھے کچھ ہی دیر گزری تھی کہ خشک پتوں کے کراہنے کی آوازیں اس کے خالی دماغ میں گونجیں پھر ایک بھاری مردانہ آواز اسے غائب الدماغی کی کیفیت سے مکمل طور پر نکال لائی۔

”السلام علیکم“ اس نے گرد آلود سیڑھیوں پہ انکلی سے لائیں کھینچنے کا شغل ترک کر کے سامنے نظر اٹھائی۔ چند لمحے اسے انجان نظروں سے دیکھنے کے بعد وہ جیسے جوشیاں لگائی۔ آگئی۔

”آپ...؟... یہاں۔“

”جی..... میں ڈاکٹر خوشنود..... اور یہاں۔“ اس کی آنکھوں میں شناسائی کی ہلکی سی رمت پا کے وہ ریلیکس سا ہو کر وہیں ذرا فاصلے پہ بیٹھ گیا۔ ”بڑی کمزور یادداشت ہے آپ کی۔ محض چوبیس گھنٹے پہلے ہونے والی ملاقات بھی آپ کے ذہن سے محو ہو گئی۔“

”جی نہیں۔ ایسی تو کوئی بات نہیں۔“ وہ اب اسے پہچانتی کہہ ذہن اس وقت کن طوفانوں کی زد میں ہے۔ وہ تو ابھی خود کو پہچاننے کے مراحل سے گزر رہا ہے، کسی دوسرے کا حوالہ کیا یاد رکھے۔“ دراصل میں آپ کو یہاں دیکھ کے حیران ہوئی تھی۔ آپ تو ڈاکٹر ہیں ناں پھر یہاں۔“

”میں ایک ذاتی کام سے آیا تھا۔ آپ یہاں پڑھیے۔“

”جی نہیں، یہ بھی یہاں ایک ذاتی کام سے آئی ہیں۔ نجانے اس ملک کے ڈاکٹروں کو ہم نیکاروں سے کیا کام پڑ گئے ہیں۔“

”السلام علیکم“

”شکر ہے سلام کا جواب تو ملا۔ ورنہ میں تو سمجھا تھا کہ سلام کرنے کے ساتھ ساتھ آپ میں سلام کا جواب دینے کی بھی روایت نہیں۔“ مقدس اس کا طنز محسوس کیے بغیر چپ چاپ بیٹھی رہی۔

”تو آپ بھی ڈاکٹر ہیں، یقین نہیں آتا“ اس نے اسٹ براؤن کڑھائی والی آف وہائٹ چادر میں سلیقے سے کپٹی اس مختصر الوجود لڑکی کو بے یقینی سے دیکھا جو چہرے پہ چھائی سنجیدگی اور پُر وقار طریقے سے اوزھے چادر کے باوجود بھی کم عمری ٹین ایجر ہی نظر آتی تھی۔

”تقریباً“ اس بار بھی اس کی طرف سے جواب شاور نے ہی دیا۔

”یہ زیر تعمیر ڈاکٹر ہیں۔ ایم بی بی ایس کے فائنل ایئر میں ہے، کنگ ایڈورڈ کالج میں۔“ اس نے مقدس کے گھورنے کی پروا نہ کرتے ہوئے تعارف کا سلسلہ مزید آگے بڑھایا، ”اور میں شاور گل، مقدس کی فرسٹ سکزن اور اکلوتی فرینڈ، یہاں منی ایجنٹ

ڈیپارٹمنٹ میں ہوں۔“

”بے گد خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔“ اس نے ہنستے ہوئے تعارف سے اگلی رسم بھی بجاوی۔

”آپ لاہور میں کب تک ہیں؟“

”کچھ صحیح اندازہ نہیں کب تک رکنا پڑے، لیکن اس ایک ہفتے تک تو واپسی کا کوئی ارادہ نہیں۔“

”تو پھر یہ میری طرف سے باقاعدہ انویٹیشن ہے آرٹ گیلری میں، ہمارے پاس پھر پھر کی طرف سے ایگزیشن ہے پرسوں۔ ضرور آئیے گا۔“

”جی نہیں، اس نے فوراً ہامی بھرنی۔ بعد میں سارے رات ہی مقدس اس سے اجنبی نظر رہی۔“

”کیا ضرورت ہے اتنے لمبے بیان کی فائنل ایئر کی اسٹوڈنٹ کنگ ایڈورڈ کالج۔“

”جی نہیں، یہاں انویٹیشن میں انویٹیشن بھی کیا۔ پتہ نہیں کب نقل آئے گی ہر کسی سے بلاوجہ فرینک ہو جاتی ہو۔ نجانے کون ہے، کیسا ہے۔ کیا سمجھ رہا ہوگا ہمیں۔“

”اوہو تم کیوں اس قدر پٹی ہو جاتی ہو اس معاملے میں۔ آخر کسی سے ذرا سا تعارف حاصل کرنے میں کوئی ذاتیات کی حدود میں داخل نہیں ہو جاتا۔ اس نے ہماری مدد کی تھی اس بات سے تو انکار نہیں ہے ناں تمہیں، پھر کیا ہوا اگر میں نے اخلاقیات سے انویٹیشن کر لیا آخر پرسوں کی ایگزیشن میں شامل سارے لوگ ہمارے واقف کار ہی تو نہیں ہوں گے۔ اجنبیوں کا وہاں آنا منع تو نہیں ہے اور پھر۔ دو ملاقاتوں کے بعد کوئی

URDU PHOTO

اجنبی نہیں رہتا۔“ شاور کو اس کی انتہا درجے کی احتیاط پسندی سے چڑھی۔

”اور پھر وہ کون ہے، کیا ہے اس کا اندازہ تو تمہیں بھی ہو ہی گیا ہوگا۔ اس قدر پولاٹ، کلچرڈ اور ویل میزڈ شخص کم از کم میں نے تو پہلی بار دیکھا ہے۔ خواتین کا احترام کرنا جانتا ہے۔ تم نے محسوس کیا اس نے ایک بار بھی ہمیں کریدنے کی کوشش نہیں کی۔ نام نہیں پوچھا۔ پتہ نہیں جانا چاہا اس سے ظاہر ہوتا کہ وہ.....“

”پلیز شانو، پلیز اسٹاپ اٹ۔“ اس نے تنگ آ کے کانوں پہ ہاتھ رکھ لیے۔ نجانے کیوں وہ اس شخص کی تعریف میں ایک لفظ مزید نہ سنتا چاہتی تھی، لیکن بھلا کسی کے چاہنے سے بھی کچھ ہوا ہے۔ ایگزیشن والے روز شاور اسے کچھ گھسیٹ کر کے اپنے ہاتھ سے لے گیا۔

اس کے نہ نہ کرنے کے باوجود اس نے مقدس کو زبردستی تیار کر لیا۔ ”یہاں اکیلی بیٹھی کیا کرو گی۔ اب چھٹیاں ختم ہونے والے ہیں، آئیے چلے آئیے، میں تمہاری ضد کے ہاتھوں مجبور ہو کے ٹوکنے نہ کسی طرح وقت گزارنا ہی ہے۔ وہ تو شکر ہے زار اور احمد نے ایگزیشن کا پروگرام بنایا ہوا تھا اور نہ میں نے تو تمہاری جان نہیں چھوڑنی تھی اگر مجھے بوریت کا شکار ہونا پڑتا۔“

”کوئی احسان نہیں کیا تم نے میرے ساتھ۔“ اس نے اس کی کیفیت میں مہربانی آئی تھی، وہ تو اب تک ادھورا ہے۔ تم سب کچھ بھلائے اپنے دوست کے کاموں میں مصروف ہو۔“ اس نے شکوہ کیا۔

”میں بھولی نہیں جان، لیکن اس طرح بار بار وہاں جانے کا کیا فائدہ؟ خیر تمہاری تسلی کے لیے کل پھر چلیں گے پتا کرنے۔“ اس نے کسی طرح بھلا چھلانگ کے اسے جاننے پہ تیار کر ہی لیا۔ وہ جانتی تھی کہ مقدس اس وقت کس ذہنی کیفیت سے دوچار ہے۔ اوتھوریٹی معلومات اسے کچلے دے رہی ہیں اور جب تک وہ کسی واضح نتیجے تک نہیں پہنچ جاتی تو اپنی امید و بیم کا شکار رہے گی۔ اب تو خود شاور بھی نے چینی سے اماں مومنہ کی منتظر تھی تاکہ آریا پارک کوئی تو حل نکلے۔ وہ مقدس کی مہمیں یا نہیں، یہ معہ تو کھلے۔

”السلام علیکم“ اس بار شاور نے خوشنود کو دیکھ کر لپک کے سلام کرنے میں پہل کی۔
 ”علیکم السلام۔“ اس نے مسکراتے ہوئے شاور کے سلام کا جواب دینے کے بعد مقدس کی طرف دیکھا۔ ”کیسی ہیں آپ؟“

”جی ٹھیک ہوں۔“ اب اتنی بد اخلاق تو وہ بھی نہ تھی کہ جواب ہی نہ دیتی۔ لیکن مزید

گفتگو سے بچنے کی خطر دانستہ رخ موڑ کے پینٹنگز دیکھنے لگی۔ ڈاکٹر خوشنود کو مکمل طور پر مقدس کی طرف متوجہ دیکھ کے شاور کھٹکی اور کچھ سوچ کے غیر محسوس انداز میں دونوں کے درمیان سے نکل گئی۔ وہ پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ پھنسائے بڑی دلچسپی سے اس کی بے اعتنائی کے مظاہرہ دیکھنے لگا۔ اس وقت آرٹ گیلری میں موجود ایک سے ایک ماڈرن ازم کی شکار لڑکیوں کے درمیان اس کا سادہ مگر پر وقار وجود انفرادیت کے احساس سے دوچار کر رہا تھا۔ سر کو مکمل طور پر ہر وقت ڈھانپے رہنے والا آنچل، سر کو قدرے اونچا کر کے پینٹنگز دیکھنے کی کوشش میں ذرا سا ڈھلک گیا تھا۔ سنبھلے بالوں کے درمیان سے نکلتی سیدھی اور شفاف مانگ میں کہیں کوئی الجھاؤ نہیں تھا۔ پیشانی کا نور یہ ظاہر کر رہا تھا کہ اس کے نام کے روبرو اس کی شخصیت میں اتنے گہرے ہیں۔ مصنوعی رنگوں سے قطعی بے نیاز لب و زخار فرتی جلد یہ عورت کی مانند دک رہے تھے۔

”اور آنکھوں میں ترسے ہوئے نیلم اس چہرے کو کس قدر بیش قیمت بنا رہے ہیں۔“ خوشنود نے سوچا۔

”کون سا تار ہے جو اس انمول تلمینے کو محروم ظاہر کر رہا ہے..... اداسی اور غم اس تار کا سبب ہے جو اس کی فرتی ہوئی شخصیت کو دھندلائے دے رہی ہے..... وہ کون سی الجھن ہے جس کے الجھاؤ نے اسے گرد و پیش سے اس قدر بیگانہ کر دیا ہے۔“ وہ اس کی کھوئی گھوئی سی کیفیت کا رونا دکھانے میں خود بھی کہیں کھوسا گیا۔

کچھ دیر کی خاموشیوں کے مقدس نے پٹ کر دیکھنا چاہا۔ شاور غائب تھی لیکن ڈاکٹر خوشنود نے اس کے عقب میں دھیرے دھیرے قدم اٹھا رہا تھا۔ اس کے یک دم اٹھنے پر وہ بھی ٹھٹک کر ٹھہر گیا۔ ان آنکھوں میں سراسیمگی سی محسوس کر کے وہ کہنے لگا۔
 ”آپ کی کزن غالباً اپنے کلاس فیووز کے ہمراہ ہیں۔“

مقدس کو اس لڑکی پہ بے انتہا غصہ آیا جو ضد کر کے اسے ساتھ لائی تھی اور اب اجنبی لوگوں میں تنہا چھوڑ گئی تھی۔ تنہا ہونے کی بے بسی اس کے ہر نقش سے عیاں ہونے لگی، جسے محسوس کر کے وہ پھر کہہ اٹھا۔

”آپ اپنی دوست پہ اتنا ڈپینڈ کیوں کرتی ہیں؟“
 ”ڈپینڈ؟ جی نہیں میں صرف اس کی عادی ہوں اور کوئی بات نہیں، ہمارا ساتھ کئی برسوں پرانا ہے اور پھر میری کسی سے کوئی خاص دوستی بھی نہیں، اس لیے اس کا میرے پاس

نہ ہونا مجھے کچھ ڈسٹرب کر جاتا ہے۔“ وہ اس کے سوال کا جواب دینے کی پابند تو نہ تھی لیکن اس کے ڈپینڈ کرنے والے الزام نے اسے جزب کر دیا تھا۔
 ”اور یہ ڈسٹربنس تو آپ پہ مکمل طور پر چھائی ہوئی ہے۔“ وہ کہنا چاہتا تھا لیکن اس کی جھنجھلاہٹ دیکھ کے خاموش ہی رہا۔

☆☆☆

اسے خان افراسیاب خٹک کے گھر آئے دوروز گزر چکے تھے۔ اس کی حالت اتنی دگرگوں تھی کہ دراب کو اسے اس طرح باچا جان کے سامنے لے جاتے ہوئے خوف محسوس ہوا اسی لیے بڑے لالہ کی ہدایت کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے وہ سیدھا زریاب کو پہنچا لے آیا تھا۔ خود افراسیاب، بھائی کا شک و جود دیکھ کے ڈھسے گئے تھے۔ ان لڑکے نے دو عتروں میں انہوں نے بھائی کی ایک جوتک تک دیکھنے سے اجتناب کیا تھا۔ شروع شروع میں جب بھی کوئی زریاب سے ملنے کی کوشش کرتا اس کی بیوی کی بڑھ جاتی۔ وہ کسی کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا، کسی سے بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ افراسیاب کی ہر اس کوشش کو بھی اس نے سختی سے رد کر دیا، جو انہوں نے اسے بچانے کے لیے کرنا چاہی، وہ اپنے اثر و رسوخ استعمال کر کے اس کی سزا کم سے کم کروانا چاہتے تھے۔ لیکن زریاب نے دو ٹوک الفاظ میں کہہ دیا۔

”میں حرام موت نہیں مرنا چاہتا، لیکن مجھے اس کے لیے مجبور مت کرو۔ اس وقت جس چیز کی مجھے سب سے زیادہ ضرورت ہے وہ یہ ہے اور جس چیز سے میں ہر ممکن طرح بچنا چاہتا ہوں، وہ زندگی ہے۔ مجھے ان بوسیدہ دیواروں کے اندر گھسنے سے روکنے دو۔ یہاں قید میرے وجود کے زندہ ہونے کی خبر تو کسی کو نہ ہوگی۔ خدا کے حکم سے اسے لے جائے۔ اشتہار مت بناؤ..... مجھے روشنی میں مت لاؤ..... اندھیرے میں پڑا رہنے دو اور زریاب کو بچاؤ۔ یہ دیواریں میرا بھرم رکھ لیں۔ مجھے زندگی کی طرف کھینچ کے لانے کی کوشش مت کرو..... میری موت کی دعا کرو۔ باعزت موت کی۔..... ورنہ..... اگر مجھے دوبارہ باہر لانے کی کوشش کی تو..... میں اپنے آپ کو ختم کر لوں گا۔ مجھے حرام موت کی طرف بڑھنے پہ مجبور مت کرو لالہ۔“ اس کے جنون اور دیوانگی سے گھبرا کے خان افراسیاب نے اسے اس کے حال پہ چھوڑ دیا، لیکن وہ اس کی موت کی دُنا نہ مانگ سکے۔ بس بے چینی سے وقت گزرنے کا انتظار کرنے لگے۔.....

وقت جو تلخ سے تلخ زہر کو بھی بے اثر کر دیتا ہے۔ وقت جو بھیانک سے بھیانک تر نکس پہ بھی گرد کی تہ جمادیتا ہے۔

وقت جو گہرے سے گہرے گھاؤ کو بھی بھرتا نہیں تو کھرند تو ضرور لے آتا ہے۔ اور شاید زریاب کے زخموں پہ بھی کھرند آچکے تھے۔ ان سے خون تو اب بھی رستا تھا، لیکن اس طرح بہتا نہیں تھا۔ اس کی ویران آنکھوں میں دیوانگی اب بھی نکریں مارتی دکھائی دیتی تھی لیکن وہ شدتیں ناپید تھیں جو اسے دیواروں سے سرنگرانے پہ مجبور کرتی تھیں۔ اس کے لب سسکیاں دبا دبا کے صراہو چکے تھے۔ آپہں بھر بھر کے اس کی سانس کے رستے زخمی ہو چکے تھے۔ لیکن چیخیں گونگی ہو گئی تھیں، دبا آئیں گنگ رہ گئی تھیں اور..... موت کی خواہش خود ہی مٹ چکی تھی۔

افراسیاب نے قسمت سے ہارے اپنے میں جانے کو بانہوں میں بھینچ لیا۔ اپنے خون کی حرارت نے زریاب کی زندگی کے کچھ آثار پیدا کیے۔ اس کے حواس بحال ہوئے تو سب سے پہلے اسے یہ خیال آیا۔

”مجھے یہاں کیوں لاؤ؟“ وہ باچا جان..... بی بی جان؟“ اسے اندیشہ سا ہوا..... ”کیوں.....“ اپنی ذات کے ساتھ الجھتے ہی اتنے برس گزار دیے، ان ہستیوں کا کوئی خیال تک نہ آیا جو اس ذات سے وابستہ ہیں۔“ اسے ندامت نے آن

باجا جان اور بی بی جان۔ کیا وہ تمہیں اس حال میں دیکھ پائیں گے زریاب، بیس سالوں کا صوبلیک ہی بل میں کھودیتے وہ تمہارا یہ حال دیکھ کر، کتنے بدل گئے ہوتم۔“

اس نے اپنے سامنے بیٹھے افراسیاب لالہ کو نظر بھر کے دیکھا جن کا کبھی وہ باچا جان کے بند مہب سے زیادہ احترام کیا کرتا تھا اور ان سے ڈرتا تو وہ شاید باچا جان سے بڑھ کے تھا۔ آج بھی ان کی شخصیت کے رعب کا وہی عالم تھا۔ بلکہ ہلکے بھورے بالوں میں جگمگاتے جاندی کے تاروں نے اور بھی دبدبہ قائم کر دیا تھا۔ سنجیدہ تاثر دیتی آنکھیں، کناروں پہ پھیلی لکیروں کے ساتھ اور بھی سنجیدہ نظر آرہی تھیں۔

زریاب نے نظر اٹھا کے ذرا ناقصی پہ کھڑے دراب کو دیکھا۔ اس کا جسم پہلے کے مقابلے میں بھر چکا تھا۔ نوکدار مونچھیں تو اس کی پہلے سے تھیں اب داڑھی کا اضافہ بھی ہو چکا تھا۔ البتہ سر کے بال خاصے جھڑ چکے تھے، جن کی وجہ سے ماتھا اور کھلا کھلا لگ رہا تھا۔

رنگت پہلے کی بہ نسبت سنو لاجپتی تھی۔

”شاید شکار کا شوق عروج پہ ہے۔“

زریاب نے اس کے کھر درے ہاتھوں اور سانولے ہوتے چہرے کو دیکھ کے اندازہ لگایا۔ دراب ایک بار پھر کرسی پہ بیٹھ گیا تو وہ مسکرایا۔ پچھلے دس منوں میں وہ چار بار اٹھ اور بیٹھ چکا تھا۔

”تو خان دراب خنک اتنی تبدیلیوں کے بعد بھی ایک چیز ہے جو اب تک ویسی کی ویسی ہے۔ تمہاری طبیعت کا بے صبر اپن اور بے چینی۔“

”کیا سوچ رہے ہو لالہ؟“ اس نے سوال کیا تو زریاب دونوں کے چہرے پر ہنس پڑی۔

باری دیکھتا ہوا کہنے لگا۔

”آپ دونوں بھی تو کتنے بدل گئے ہیں۔ اتنے بڑے بڑے رنگ رہے ہیں۔“

”صرف بڑے...“ ان فریاد نے اسے احساں ہلایا۔

”کبھی غور سے خود کو دیکھا ہے زر، تم بوڑھے دکھتے لگے ہو۔“ زریاب نے بھائی کے ہاتھوں کی مضبوط اور محفوظ گرفت سے اپنا استخوانی ہاتھ ہٹائی سے نکالا۔ لمبی لمبی انگلیوں پر زرد کھال منڈھی تھی اور فرانجی مشقت کے تمام شہدات تباہی کے نشان تھے۔ اس نے اپنے چہرے پہ ہاتھ پھیر کے یہ سچ محسوس کرنا چاہا وہاں پھر یاں ہی پھر یاں میں۔

سلوٹس ہیں میرے چہرے پہ پھر حیرت کسی زندگی نے مجھے تم سے زیادہ پہنایا۔

☆☆☆

خوشبو ہے، دھنک ہے چاندنی ہے وہ اچھے دنوں کی شاعری ہے

بھیکے ہوئے پھول حرف اس کے وہ رم جہم کی زباں میں بولتی ہے

باتوں میں تھکن ہے شام جیسی لہجے میں سحر کی تازگی ہے

پہرے پہ حیا کا روپ جیسے دریا میں شفق شعل گئی ہے

برسا ہے خمار چاندنی کا یا

اس کی جبین دک انھی سے کیا جانے وہ کیسے مسکرائی

چہرے سے کرن چھن پڑی ہے چہرے پہ بکھر کے زلف اس کی

سورج سے خراج مانگتی ہے پل بھر کو سرک گیا جو آنبل

کلیوں کی طرح لمست گئی ہے الے... مشتریاں حسن عالم!

خوشنود نے بڑا طلوع اشک اور سینے پہ دھڑکے پونہی نیم دراز سوچنے لگا، خوشبو

ہے، دھنک ہے، چاندنی ہے۔

خوشبو، دھنک اور چاندنی کا مزاج بھی بھلا کہیں ہوا ہے... ہزار بار یہ بات اس نے کہی ہے۔ آئی کی اسے غزال کا پڑھ کر اور ہر بار ہی وہ سر جھٹک کے مسکرا دیا تھا۔ لیکن اب کون سی بات ہے جسے وہ جھٹکا کرتا ہے۔ کیا اس کے مسکرانے سے کرنیں نہیں چھن پڑی تھیں؟

کیا اس کے لہجے میں سحر کی سی تازگی نہیں ہے؟ کیا اس کی جبین چاندنی میں نہائی ہوئی نہیں لگتی؟

اور کیا وہ... دونوں جہاں سے قیمتی نہیں لگتی؟

اور یہ آخری سوال وہ خود سے کر کے چونک گیا تھا۔

”کچھ تو اس میں سے خوشنود جس نے تمہیں اتنا بے خود کر دیا ہے ورنہ جن حالات میں تم یہاں آئے ہو ان کی نشانی کیا اس بات کی اجازت دیتی تھی کہ تم سب کچھ فراموش کیے آرت میٹری میں ایک مشکل سی الجھی ہوئی سی لڑکی کے پیچھے خوار ہوتے رہے؟“

اس کے دل نے اسے مزید کریدا تو وہ چپکے سے اقرار کر گیا۔

”ہاں... کچھ نہیں بہت کچھ ایسا ہے جو مجھے اس کی جانب کھینچتا ہے۔ جو مجھے وقتی طور پر ہی سمی مگر بھلا دیتا ہے کہ میں یہاں کس لیے آیا ہوں۔ کاش کہ وہ بھی یہ جان لے کہ

وہ کسی کے لیے کتنی ضروری بن گئی ہے۔“ اس نے خدا سے دعا کی، کوئی معجزہ ہی ہوتا جو اسے مقدس کے آگے اظہار کی طاقت دے پاتا، ورنہ اس کی حد درجہ بے نیازی اور لاعلمی سا رویہ خوشنود کی ہمتیں پست کر دیتا تھا۔

پرواہ ہی نہیں اسے کسی کی
اپنے سے وہ کتنی اجنبی ہے
وہ غنچہ دہن سکوت زادی
کھلنے پہ بھی کم ہی بولتی ہے

☆☆☆

”تمہیں کیا میری بات کا بالکل بھی اعتبار نہیں رہا جو خود چلی آئی ہو۔“
اپنے انتظار میں ٹہلنا دیکھ کے جل ہی تو گئی۔
”پھر کیا کروں میں؟“ وہ بے بسی سے کہتی۔
”تین دن سے تم یہی کہہ رہی ہو کچھ پتا نہیں چلا، کون خبر نہیں لی۔ آخر کب تک میں

.....“
”وہ اماں برکتے تو اب میری صورت دیکھ کے بھڑک جاتی ہے۔ ویسے جس انداز میں وہ جھنجھلاتی ہے میرے سوال پر۔ اس سے مجھے تمہاری کچھ کچھ یقین میں بدلتا نظر آتا ہے کہ واقعی وہ جانتے بوجھتے انجان بننے کی کوشش کر رہی ہے۔ میں سمجھتی تھی کہ وہ بدل کے دوسری جانب چل پڑی۔ صاف لگ رہا تھا مجھ سے چھپنے کی کوشش کر رہی ہے۔ بعد میں پتا چلا کہ کسی کام سے ہاسٹل سے باہر چلی گئی ہے۔“

”اوہ، تو تمہیں پیچھا کرنا چاہیے تمہاناں اس کا۔“
”پیچھا کرنا چاہیے تھا، پاگل ہوئی ہو کیا، اب میں مائیوں کا پیچھا کر لی پھروں۔“ وہ بگڑ کے بولی۔

”تم سے کچھ نہیں ہوگا۔ اسی لیے میں خود آئی ہوں آج۔ کاش کچھ دیر پہلے آ جاتی تو... مجھے یقین ہے وہ اماں ہم سے کچھ چھپا رہی ہے۔ لیکن میں بھی اس سے ضرور اٹھوا کے رہوں گی۔ بس ایک بار مجھے پتا چل جائے کہ کیا واقعی وہ... میری ماماں یا نہیں۔“
”اچھا یہ بتاؤ کچھ کھاؤ پیو گی یا یہی باتیں کرنے آئی ہو؟“ شاور نے اس کا دھیان

بٹانا چاہا۔

”میرے پاس فی الحال اس موضوع کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ سچ پوچھو تو میں اس بار لاہور بھی صرف اس لیے آئی تھی شانودرنہ جس ذہنی کیفیت سے میں گزر رہی ہوں اس میں کالج جانا محض وقت ضائع کرنے کے مترادف ہوتا۔ لیکن مجھے خدشہ ہے کہیں میرا یہاں آنا اک کارزیاں نہ ثابت ہو۔“

”اُف خدایا، کس قدر مشکل الفاظ بولنے لگی ہو تم۔ غالباً تمہارے کہنے کا مطلب ہے کہ اگر وہ خاتون تمہیں نہ ملیں تو تم بار لاہور آنا بے کار جائے گا، ہے ناں۔“ وہ تصدیق کے لیے زُکی۔

”تو مائی ڈیر کزن یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔ قدرت کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی بہتری ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے اس بار کے تمہارے لاہور کے سفر نے تمہاری تقدیر میں کچھ اور لکھ دیا ہو۔“

”مثلاً.....“ وہ زُکی کے سوچنے لگی کہ کبے یا نہ کہے حالانکہ یہ بھی غیر معمولی بات تھی کہ شاور اور کچھ کہنے سے قبل سوچنے کی زحمت کرے۔ پھر اپنی ازلی بے دھڑک انداز میں کہہ اٹھی۔

”مثلاً ڈاکٹر خوشنود۔ نہ تم لاہور آنے کا اتنا اچانک فیصلہ کرتیں، نہ ہم بائی روڈ سفر کی سہولت لیتے اور نہ ہی وہ..... مانوس اجنبی نکراتا۔“
”وہ کون؟“
”وہ کون؟ تمہیں پتا ہے تم کیا بک رہی ہو؟“ حسب توقع مقدس کی گلابی رنگت کا حدت چہرے کے اتاروں ہو گئی۔

”سب پتا ہے۔ وہ اس کے بلند لہجے کے رعب میں قطعی نہ آئی۔“
”اور تم جانتی ہو کہ تمہاری ہر بات کا پتا پہلے مجھے چلتا ہے بعد میں تمہیں۔ بلکہ جب تک میں تمہیں نہ بتاؤں تمہیں تو یہ بھی خبر نہ ہو کہ تم سوچ کیا رہی ہو اور چاہتی کیا ہو۔“
”تو تم بھی یہ سمجھتی ہو کہ میں تم پہ ڈپینڈ کر لی ہوں۔“ اس کے اس قدر درست اندازہ لگانے پہ مقدس تلملا گئی۔

”میں بھی.....؟“ شاور ”بھی“ پہ زور ڈالتے ہوئے بولی۔
”تو گویا کوئی اور بھی ہے جو اس راز سے واقف ہے۔“
”فضول باتیں مت کرو۔ بات کوئی ہو رہی ہو تمہیں ضرور سچ میں اپنی بے ہودہ

ریسرچ پیش کرنی ہوتی ہے۔“

”تم چاہے اسے بے ہودہ کہو یا فضول۔ لیکن دیکھ لینا میری اس ریسرچ کا رزلٹ سو فیصد درست نکلے گا۔ ڈاکٹر خوشنود کا بار بار تم سے نکرانا بے مقصد نہیں ہے۔“

”مت بھولو کہ ہر بار میرے ساتھ تم بھی ہوتی ہو۔“ اس نے باور کرایا۔

”میں تو نہیں بھولی، لیکن کیا کروں ڈاکٹر صاحب کو بھی یاد نہیں رہتا کہ تمہارے ساتھ، میں بھی ہوتی ہوں۔ بلکہ وہ تو تمہیں دیکھ کے شاید خود کو بھی فراموش کر دیتے ہیں۔“

”تم یہاں بیٹھ کے اس خود ساختہ فلمی کہانی میں رنگ بھر دو اور چسکے لے لے کے سوچو جو بھی سوچتا ہے۔ کم از کم میرے سامنے یہ بات اب مت کہنا ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں

ہوگا۔ سمجھیں۔“ وہ بیگ کا ندھے سے نکال کے کھڑی ہو گئی۔

”ارے..... ارے رکو تو! اور وہ رک گئی۔“ ڈاکٹر خوشنود نے اسے روک دیا اور کہا: ”اور کوئی کھڑی سلور گرے کر دلا سے اترتی ایسا بھرتے ہو۔“

نہیں، خوشنود تھا۔ اگرچہ اس کا چہرہ واضح طور پر دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ چہرے اس کا دراز قد، اور غیر معمولی چوڑے شانے اسی کا شائبہ دلا رہے تھے۔ باہر کی طرف نکلتی مقدس نیم وا

بڑے سے گیٹ کی اوٹ میں ہو گئی۔ اماں کار سے نکلنے کے بعد بھی ہنوز پچھلی سیٹوں سے کچھ سامان نکالنے میں مصروف تھی۔ آخر کار وہ اپنی طرف کا دروازہ کھول کے باہر نکلا۔

ڈاکر گرے ٹوپیس سوٹ کے ساتھ بلیک شرٹ اور بلیک ٹیگ میں وہ وقت کی خوشنود تھا۔ اس نے جیک کے اماں کو سامان اٹھانے میں مدد دی دو شاپنگ بیگز میں خوشنود سوٹ

تھے جو شاید استعمال شدہ لگ رہے تھے۔ باسکٹ میں تھرماس اور چند برتن، ایک اسٹیل پیپر کے ڈبے کے ساتھ رکھے تھے۔ چند قدم آگے چلنے کے بعد وہ اپنی بلند آواز میں پوچھنے لگی۔

”میں کہیا پتر، اے اس کھانا پیتا ہے، کھیں، کہ میں سویرے بخنی تے دلہ بتایا واں؟“ (میں نے کہا بیٹا، ابھی اس نے کچھ کھانا پیتا تو نہیں؟ یا پھر میں صبح بخنی اور دلہ

بتلاؤں) نجانے خوشنود نے کیا جواب دیا تھا۔ مقدس اماں کو گیٹ کی طرف بڑھتے دیکھ کے پیچھے ہو جانے کی وجہ سے صحیح طرح سن نہیں پائی۔

”کون سے ہاسپٹل سے آرہی ہیں آپ اماں؟“

مقدس نے اچانک سامنے آ کر اماں برکتے کو گڑ بڑا کے رکھ دیا۔

”کدوں؟ میں کدوں گئی کتھے؟“ (کب میں کب کہیں گئی ہوں؟) وہ آئیں بائیں شائیں کرنے لگیں۔

”آپ مجھ سے کیوں چھپا رہی ہیں۔ کیوں نہیں مجھے بتا دیتیں ان کے بارے میں۔“ وہ قدرے بلند آواز میں بولی۔ شادور بھی قریب چلی آئی۔

”اور اماں، یہ شخص کون تھا، تمہارا کیا لگتا ہے؟ کہاں گئی تھیں تم اس کے ساتھ۔؟“ اس نے بھی اماں برکتے کو گھیر لیا تو وہ ہنستے سے ہی ’کمز گئی۔ اچانک مقدس کے حملے نے

اسے چونکا ضرور دیا تھا، لیکن ذرا سنبھلنے کے بعد وہ پھر اپنی جون میں آ گئی۔

”پراں ہٹو کر یو، تھانے دار نیوں، کتھوں آگیاں میں میرے نال پچھ پریت کرن والیاں، تمہاری نہیں دی کتھے نہیں، ماما لگد آئے او بندہ تہا ڈاتے نانی لگنی آں میں جیہڑی

تہانوں تسلی کراواں لے (پرہے ہٹو کر یوں، تھانے دار نیوں، کہاں سے آگنی ہیں، مجھ سے پوچھ گچھ کرنے کے لیے۔) کسی نے تمہیں نہیں سکھائی تمہیں۔ وہ تمہارا نانا لگتا ہے یا میں تمہاری نانی لگتی ہوں جو تمہارے سوالوں کے جواب دوں) وہ بری طرح جھڑکتی آگے چل پڑی۔

”لو کروالی عزت افزائی۔“ شادور نے اسے بتایا۔

”ویسے یار، واقعی سوچنے والی بات ہے ڈاکٹر خوشنود کا اس مائی سے کیا تعلق؟“ اس نے پاس تو کارڈ بھی تھانا ان کا۔ اس بھڑکیلی اماں سے سر پھوڑنے کے بجائے تم

سے پوچھ لو۔ شاید کوئی سرابا تھ لگ جائے۔ نہ بھی ہو تو کم از کم تمہاری تسلی تو ہو جائے گی۔ وہ محض انسانی ہمدردی کی بنا پہ اسے لفٹ وے بیٹھے ہوں یا اس کی کسی

مشاورت کا سہارا لے کر رہے ہوں۔“ شادور کی عادت تھی وہ ہمیشہ مسئلہ پیش کرنے کے بعد اس کے کئی ایسے حل بھی بتا دیتی تھی۔ یا یوں کہیے کہ کسی بھی بات کے مثبت و

منفی پہلو دووں ہی سامنے دکھ دیتی تھی۔

”ڈاکٹر خوشنود وہی دردگ۔“

کارڈ پہ لکھے نام پہ سرسری سی نگاہ ڈال کے وہ نیچے درج فون نمبرز کی جانب متوجہ ہونا چاہتی تھی لیکن خوشنود کے نام کے آگے لگے حوالے نے اسے نمجد کر دیا۔ خوشنود کا ”دردگ“ ہونا اسرار خاتون کا مومنہ ہونا، ثابت کر رہا تھا۔

URDU PHOTO

کرتیں۔ ان کا ٹھکانا دن بھر لاونچ میں بچھاوہ جہازی ساز تخت ہو تا جہاں سے وہ با آسانی دن میں کئی کئی بار اٹھ کے باچا جان کے کمرے تک ہو آتیں۔ لیکن آج تو انہوں نے اپنے خان جی کے کمرے میں بس صبح ایک ہی بار بھانکا تھا۔ بستر پہ بے حس و حرکت پڑے لائے مگر خیف سے وجود کی گدلی آنکھیں چھت پہ لگے تنکھے پہ جمی تھیں۔

”خان جی!“ انہوں نے آواز دی۔

”زریاب!“ تھکی تھکی سانسوں سے ڈولتا یہ نام ان بوڑھے لبوں سے آزاد ہوا اور منتظر بے بس آنکھیں دروازے کی طرف اٹھ گئیں۔ بی بی جان کو دھچکا سا لگا اور پہلی بار..... پہلی بار وہ خان ارباب خٹک کو کوئی دلا سے دیئے بغیر، کوئی خوش آئند خبر سنائے بغیر واپس لوٹ گئیں۔ آج تو انہیں خود کسی تسلی بھرے ہاتھ کی ضرورت تھی، چلتے تڑپتے پہاڑ پہلے تکیے پہ سر رکھا ہی تھا کہ پیچھے مردان خانے سے کچھ شور سنائی دیا۔ عموماً انرا سبب کے آنے پہ اس طرح ہلکڑ مچا کرتی تھی اس کی سرکاری گاڑی کے ساتھ کارڈ اور کن مین کا ایک ریلوے بھی تو ہوتا تھا انہوں نے لینے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور اٹھ کے کمرے گئیں۔ ابھی اپنی بڑی سی چادر پھیلا کے شانوں پہ ڈال ہی رہی تھیں کہ دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا ان کی پرانی ملازمہ وگمہ حواس باختہ سی پھولے ہوئے سانسوں کے ساتھ اتر گئی۔ بی بی جان نے اس کی جسارت کو ناپسندیدہ نگاہوں سے دیکھا۔

”ولے جنے؟“ (کیا ہے لڑکی؟)

”زریاب لالہ راغلے۔“ (زریاب صاحب آگئے۔)

”ولے؟“ (کیا؟) وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ”سوخ زریاب؟“ (مگر زریاب؟)

”خاہ جی“ (ہاں جی)

انہیں کچھ پتا نہ چلا کب وہ کمرے سے نکلیں کب بیڑھیاں اتریں اور کب وہ اس سے رو برو تھیں۔

”زریاب.....!“

انہوں نے سامنے کھڑے شکستہ وجود والے بارے ہوئے انسان میں وہ شہزادیوں کی سی چھب ڈھونڈنا چاہی۔ ان چمکتی آنکھوں میں ہر دم ہلکورے لیتا وہ معصومیت بھرا جس تلاشنا چاہا وہاں فقط ٹوٹے ہوئے آئینے کی کرچیاں تھیں۔ وہ متذبذب سے کھڑی رہ گئیں دل کسی طرح ماننے کو تیار نہ تھا یہ وہی خان زریاب خٹک ہے جسے وہ آنکھ بھر کے دیکھتے بھی

گھبراتی تھیں۔ مبادا اپنی ہی نظر لگ جائے۔ زریاب اپنا کرچی کرچی وجود خود ہی سمیٹ کے بی بی جان کے گلے لگ گیا۔ ان کے بازوؤں نے بڑھ کر اسے سمیٹا۔ ممتا کے گرم جوش سینے سے لگ کے برسوں سے ٹھنڈا پڑتا خون پھر سے اٹل پڑا۔ اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ اپنے ہی آنسو اس کے لیے اجنبی اجنبی سے تھے۔ وہ تو کب سے نہیں رو دیا تھا، کب سے نہیں ہنسا تھا۔ بلکہ اس نے تو بہت عرصہ پہلے ہی وہ سب کرنا چھوڑ دیا تھا جس سے اس کے زندہ ہونے کا احساس ہوتا۔ حضرت بی بی نے دونوں ہاتھوں سے اس کا چہرہ تھاما اور کپکپاتے لہجے میں کہا۔

”میں صبح سے سوچ رہی تھی کہ خان جی کا سامنا کیسے کروں۔ ان کی آنکھوں کے سوال اب تمہارے نالے نہیں جاتے تھے۔ اللہ نے مجھ پہ کرم کر دیا اب میں خان جی کے پاس جاؤں گی، ان کا ہاتھ پکڑ لے کر۔“

☆☆☆

طویل کوریڈر سے گزرتے ہوئے خوشنود اور مقدس دونوں ہی متنہاد کیفیات کا شکار تھے۔ خور سے دو قدم کے فاصلے پہ پہنچے جو مقدس کا سنا سنا وجود خوشنود کو اک خواب سا لگ رہا تھا، ان کے ذہن میں بہت سے سوال نکلبا رہے تھے، لیکن ان سب سوالوں کو زبان دے کر وہ اس خواب سے نکلتا نہیں چاہتا تھا۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ یہ خواب اسے کہاں تک لے کے جاتے ہیں۔ اسلام آباد سے لاہور روانہ ہونے سے ایک روز قبل ہی اس خط کا ملنا شاید اس خواب کی تمہید بھی بنا۔

لاہور پہنچنے کے بعد ہی اس اتفاقہ ملاقات نے اسے پہلی بار اک خواب دیکھنے پہ اکسا دیا۔

ابھی تو اس نے دل کی باتوں میں نہ آتے ہوئے خواب دیکھنے سے ہر ممکن احتراز کیا تھا کہ چند اور حادثاتی ملاقاتیں آنکھوں کو خوابوں کا ذائقہ زبردستی سونپ گئیں۔

اس کو خود سے تمکھام ہوتے دیکھنے کا خواب.....

اس کے ہمراہ قدم بہ قدم چھنے کا خواب.....

اور..... اور وہ دیکھنا چاہتا تھا یہ خواب اسے کہاں تک لے کے جاتے ہیں۔

مقدس کا ہر اٹھتا قدم اس کے دل کو منشی میں جکڑ لیتا تھا۔ آج وہ ایک ایسی ہستی کو دیکھنے جا رہی تھی جو شاید کسی بھی انسان کی دنیا میں سب سے قریبی اور عزیز ترین ہستی ہوتی

متوجہ تھیں اپنے پیچھے لمبے لمبے ڈگ بھر کے واپس جاتے ڈاکٹر خوشنود کی طرف تو اس کا دھیان ہی نہ گیا۔

☆☆☆

”سب کچھ کتنا واضح تھا، بالکل صاف..... نجانے مجھے سمجھنے میں وقت کیوں لگا۔ اتنا وقت..... اتنے میں تو اب..... اب کچھ بھی میرے بس میں نہیں رہا۔“ پی سی میں بک اپنے کمرے میں آ کے خوشنود نے نئے سرے سے اس سارے قصے کو سمجھنا چاہا۔

”تو وہ ان کی بیٹی ہے، یعنی صرف ان کی نہیں بلکہ خان زریاب خٹک کی۔

کیا ضرور اسے ہی خٹک خاندان کی بیٹی ہونا تھا؟

اور کیا یہ بھی ضروری تھا کہ اس شخص کا حوالہ اس کے ساتھ ہوتا؟

ڈاکٹر خوشنود علی وردگ.....
 لیکن.....

تقدیر اپنے فیصلے، سارے نفع نقصان ذہن میں رکھ کے نہیں کرتی۔ اسے پیچیدگیاں پیدا کرنے کا شوق ہے۔ اچھی بھلی سیدھی سادی چلتی کہانی میں نیا موڑ لانا تو قسمت کی عادت ہے۔“ وہ بے بسی سے آنکھوں پہ بازو رکھ کے اس حقیقت کو تسلیم کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ اس کے سوا اب اور کوئی چارہ بھی تو نہ تھا۔ خون کا معاملہ تھا..... خون کا

مادر باہتھا۔ اور یہ فیروز علی وردگ کا خون خود خوشنود علی وردگ کے جسم میں ٹھاٹھیں

خون کی یہ تاثیر تھی کہ جس کے خوف سے اس کی ماں لائی بی بی نے اسے اپنی آنکھوں سے دور کر لینا گوارا کر لیا۔ وہ ڈرتی تھیں کہ سید و شریف کی فضاؤں میں موجود فیروز کی جوان اور المناک موت کے نوے کہیں کچے ذہن کے خوشنود کو اس راہ پہ نہ چلا دیں جس پہ چلنا پختون اپنی شان تصور کرتے ہیں ایسے میں وہ خود کو صرف ایک غیرت مند پختون کی حیثیت سے منوانا چاہتے ہیں، بھول جاتے ہیں کہ وہ کسی کا سہاگ بھی ہیں، کسی کی گود کا پھول بھی ہیں، کسی بہن کی تمام تر امیدوں کا مرکز بھی ہیں۔

آج سے کچھ دن پہلے اس نے بھولے بھٹکے بھی بس یہ تصور نہیں کیا تھا کہ وہ کبھی اس ہستی سے مل پائے گی۔..... اس ہستی کا اس دنیا میں وجود ہے بھی یا نہیں۔

اور پچھلے کچھ دنوں سے وہ اٹھتے بیٹھتے، جاگتے سوتے، اسی ایک ہستی کو سوچ رہی تھی، اس کے پیکر کو تصور میں تراش رہی تھی اور آج..... آج..... محض چند قدم کے فاصلے پہ..... چند ساعتوں کے بعد وہ اس کے روبرو ہوگی۔ خوشنود کے تھمتے قدموں نے اسے بھی رُک جانے پر مجبور کیا۔ اس نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا اور پھر اس کے اشارے پہ آئی سی یو کی گلاس وال کے آگے کھڑی ہوئی۔

ایک..... دو..... تین اور نمبر تین بیڈ پہ اس کی متلاشی نظریں جم گئیں۔ آکسیجن ماسک سے ڈھکا وہ چہرہ صرف ایک ہی رخ سے نظر آ رہا تھا لیکن کپڑوں کو اس پہرے سے آشنائی حاصل کرنے کے لیے ایک ہی نقش کافی تھا! وہ بیٹھے اچھل کودی چند قدم آگے سر کی لیکن وہاں سے یہ ادھورا نگہ بھی نظر آتا بند ہونیا وہ پہرے کے پھرے آگے جگمگاتی خوشنود حیرت زدہ سا اس کی بے تائیاں سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے اپنا کارڈ دکھا کے ڈیوٹی پہ موجود نرس سے اجازت طلب کی اور اسے اندر لے آیا وہ کسی معمول کی طرح اس کے پیچھے چلتی بیڈ نمبر تین کے پاس آ کھڑی ہوئی۔

کھڑی مغرور ناک اور گداز کناؤ دار لبوں والے چہرے نے اتنے اثرات نمایاں نہیں کیے تھے جتنے کہ بیماریوں نے، یہ اس چہرے کی جھریوں سے پاک شفاف جلد سے ظاہر ہو رہا تھا۔ لیکن نیلے پڑتے ہونٹ، آنکھوں کے نیچے گہرے سیاہ حلقے اور ہاتھوں پیروں کا لائونر پن اس بات کا گواہ تھا کہ دل کا یہ شدید دورہ پہلا تھا نہیں تھا اور ایک طرف کا زخماں..... جلے ہوئے نشانات لیے نجانے کن کہانیوں کو چھپا رہا۔

ہولے سے اس چہرے کو چھونا چاہا۔ ان سیاہ پڑتے تھکے ماندے لرزتے پوٹوں کے نیچے کیا اب بھی شہد کی جھیلیں آباد ہیں۔ اس کی آنکھیں برس پڑیں۔

”مما.....!“
 اور..... خوشنود علی وردگ کا خواب ٹوٹ گیا۔
 اپنے خیالوں میں گم کھڑی مقدس خوشنود کے چہرے کا بدلتا رنگ دیکھ سکی، نہ جھجک کے دو قدم پیچھے ہٹنا محسوس کر سکی۔ اس کی تمام تر حیات تو سامنے موجود مومنہ علی کی طرف

لالی بی بی خود بھی ایک کچی پختون زادی تھی، آن، بان اور وقار پہ سب کچھ نچھاور کر دینے والی لیکن ممتا کا جذبہ کب اس کے سارے جذبات پہ حاوی ہو گیا اسے پتہ ہی نہ چلا وہ شوہر کے اعداد بٹے کو کھونے کا حوصلہ نہیں رکھتی تھی، پھر فیروز کے ساتھ سات سالہ رفاقت نے اسے یہ بھی سمجھا دیا تھا کہ خود فیروز اپنے قبیلے کے دیگر مردوں سے کس قدر مختلف المزاج ہے۔ اپنے بھائیوں کی بانہست وہ اپنے کمن بیٹے کے میلے بار فائر کرنے پہ جشن منانے کے بجائے اس کی تعلیم پہ زیادہ توجہ دیتا۔ اس نے بیٹے کو اعلیٰ تعلیم دلا کے کچھ بنانے کا خواب دیکھ رکھا تھا۔ اس حقیقت سے سب ہی واقف تھی۔ لالی بی بی نے سر اور باپ کے آگے گڑ گڑا کے فیروز کے خوابوں کو پورا کرنے کی بھیک مانگی، انہیں احساس دلایا کہ فیروز جیسے محبتوں سے گندھے حساس شخص کی پرورش کی تکمیل اس کے خوابوں کو پورا کرنے تک پہنچانے میں ہے، نہ کہ خون کی ندیاں بہا کے جذبہ انتقام کو پورا کرنے میں، لالی بی بی نے بیرون ملک حصول تعلیم کے لیے اپنے بیٹے کو لائسنس دیا اور وہیں لالی بی بی نے اپنے دوست اس کا باپ عین عالم شباب میں محض ایک عہد کی پابندی میں اپنے سب سے قریبی دوست کے ہاتھوں، غداری اور بے وفائی کا مکروہ التزام لے کر مارا گیا۔ لیکن وہ عہد کیا تھا اور وہ التزام کیا تھا۔ اس سے وہ اب تک انجان ہی رہا۔ اس کی ماں اسے ہر بات سے انجان ہی رکھنا چاہتی تھی، وہ تو شاید یہ سب بھی اس تک نہ پہنچنے دیتی لیکن دادا اور چچاؤں کی جانب سے اسے ہمیشہ اُکسادینے والی معلومات ملتی رہیں۔ وہ بدشکلی سب تک دل میں بدلے کی چنگاری سلگائے بیٹھے تھے اور فیروز کے اکلوتے بیٹے کی جانب سے بھی ایسی ہی خاندانی شان و جلال کی توقع رکھتے تھے۔ لیکن لالی بی بی کا فیصلہ بروقت تھا اور اقدام بائیس درست۔ آزاد فضا کی وسیع النظری نے اس کے اندر جذبہ کھلنے دیا۔

حویلی میں: دینے والی چھ میگوئیوں کو وہ سر جھٹک کے نظر انداز کرتا رہا۔ اسے احساس تھا کہ اتنے سالوں بعد بھی اس کے ضعیف دادا یہ کاری ضرب بھلا نہیں پائے اور چچا، تایا اپنے اپنے کنبوں اور کاروباروں میں مشغول ہو گئے پھر بھی اب تک گھات لگائے بیٹھے ہیں اس نے اپنے رویے سے ان کی ہر طرح کی توقع کو مسترد کر دیا۔ اور پورے دھیان کے ساتھ ”فیروز ہاسٹل“ کی تیاری میں لگن دو گیا۔ لالی بی بی نے اسے جو تربیت دی تھی اور روشن خیال باپ کے خون کی جو تاثیر اس میں موجود تھی اس کے زیر اثر باپ کی محبت کو خراج

تحمین پیش کرنے کا اسے اس سے بہتر حل کوئی نظر نہ آیا۔ اسے نہ تو باپ کے قاتل سے کوئی سروکار تھا نہ ہی بدلہ لینے کی تڑپ تھی اور یہ تو اسے اس دن پتا چلا کہ بظاہر انجان بنے رہنے کے باوجود اس کے اندر کبھی بہت اندر نفرت کی جڑیں موجود ہیں۔ وہ کچھ مشینری کے سلسلے میں سنگاپور روانہ ہونے والا تھا کہ سید و شریف سے جان محمد اپنی خان بی بی کا راز دارانہ پیغام لے کر پہنچا۔

”اس خط کے ساتھ موجود دوسرے رقعے میں اس عورت کا پیغام اور پتہ موجود ہے جس کی مرتے دم تک مدد کرنے کا تمہارے مرحوم باپ نے عہد کیا تھا۔ فیروز علی وردگ کی بیوی ہونے کی حیثیت سے میں اس کے تمام عہد بھاننے کی پابندی ہوں اور تمہاری ماں ہونے کی حیثیت سے تمہیں حکم دیتے کی ممتا رکھی ہے۔ یہ عورت جسے تمہارے مرحوم باپ نے تحفظ اور عزت دینے کا عہد کیا تھا اور اسی عہد کو نبھاتے ہو اپنی جان بھی گنوا بیٹھا، تمہارے باپ کا عہد احترام ہے۔ اس تک فیروز پہنچو اور اپنی لختا ہندی روایات کے مطابق عہد کی پابندی کا فریضہ نبھاؤ۔“

وہ الجھا اور ساتھ میں موجود شکستہ تحریر والے مختصر سے خط کو پڑھنے لگا۔

”تم سے رخصت ہوتے وقت میں نے وعدہ کیا تھا کہ زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پہ تمہیں ضرور بیکاروں کی۔ میں شاید اپنی زندگی کی آخری گھڑیاں گن رہی ہوں اور میں نے یہ کیا ہے کہ انسان کی اپنی شناخت اور کچھ نہیں، سوائے اس کے اپنوں کے، نہ مٹی نہ خون ہے۔ تمہارے رشتوں کے بعد میں نے خون کے رشتوں میں پناہ لینا چاہی۔ تمہارے رشتوں میں محض اس لیے آن بسی کہ یہاں میری جڑیں ہیں، یہاں میری قبر ہے۔ میرے دادا کی مجھے قبول کر لے گا۔ اس شہر نے میرے وجود کو دنیا سے چھپا لیا لیکن گلے نہ لگایا۔ گلے لگانے کے لیے مجھے آج بھی اپنی مٹی کی ضرورت ہے اور اس مٹی کو ڈالنے کے لیے کسی اپنے کی مٹی کی۔“

میں تم سے اور کچھ نہیں مانتی بس تمہیں اس عزت کا واسطہ جو فیروز اللہ نے مجھے دی تھی اور اس محبت کا واسطہ جو اس کے حوالے سے میں نے تمہیں دی تھی، مجھے بے یار و مددگار مرنے مت چھوڑنا۔ میں چاہتی ہوں کہ پہاڑوں کے بیچ ہی سہی میری بھی ایک قبر ہو، اپنے باپ کی طرح۔ جہاں چند لوگوں کو ہی سہی مگر کسی کو خبر تو ہو کہ اس مٹی کے نیچے میں سو رہی ہوں میں۔

فقط ایک فاتحہ اور ذرا سی زمین کی

طلب گار۔

مومنہ

اس نام سے تو وہ بخوبی واقف تھا اور اس نام کے ساتھ ایک اور نام بھی تازہ ہو جاتا تھا، خان زریاب خٹک کا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ خان زریاب کے ہاتھوں اس کے بابا جان کے ہاتھ مارے جانے میں اس عورت کا کردار کیا رہا ہے۔ وہ تو اتنا جانتا تھا کہ ماں نے ہمیشہ مومنہ نامی خاتون کا غائبانہ تعارف اس سے بڑے احترام اور محبت کے ساتھ کیا ہے۔

وہ اس محبت کی وجہ جاننے سے قاصر تھا۔ زریاب خٹک جیسے درندے سے اتنی نفرت ہوئی ہے اس کی بیوی کا ذکر اتنے اچھے الفاظ میں کیوں؟ اب بھی ماں کا حکم نامہ پڑھ کے وہ اُلٹ گیا۔ اسے اپنی بی بی کی بی بی سے بھی بڑی خواہش سراسر فضول لگ رہی تھی۔ اگر وہ لب لباب سے اس کی بات کرے تو اس کا بندوبست ہی کرنا چاہتی ہیں تو کسی بھی قابل اعتماد ملازمہ کے ہاتھوں فریضہ ادا ہو سکتا ہے۔ جان محمد بھی یہ کام کر سکتا ہے۔ اس نے فون پہ ہلکا سا احتجاج کرنے کی کوشش بھی کی لیکن اسے مسترد کر دیا گیا۔

”اس نے کسی اپنے کی خواہش کی ہے خوشگوار اور کئی کئی بار اس کی اولاد سے زیادہ اور کون اپنا ہو سکتا ہے۔ تم بحث میں وقت ضائع کرنے کے بجائے فوراً لاہور چلی جاؤ۔“

بڑی ہی بے دلی سے وہ اپنا سارا پروگرام اسے بھٹک کر لاہور چلا گیا۔ وہ اس کی سانس کی سانس کچھ دن اور رہ جائیں۔ کھانا کھا کر بے چارے کو دلی سے لے کر لاہور لے گیا۔ وہ اس سے لے کر سرور سہا پتل لے آئی جہاں سے بڑی دقت کے ساتھ اپنا مدعا بیان کر پایا۔ وہ اسے لے کر سرور سہا پتل لے آئی جہاں کوریڈور میں زمین پہ پڑی اس عورت کی حالت دیکھ کے وہ دہل گیا یہ تو وہ جانتا تھا کہ سرکاری ہسپتالوں میں غریبوں کا ”مفت علاج“ کس طرح ہوتا ہے، لیکن یہ اندازہ نہ تھا کہ اگر غریب کے ساتھ ساتھ کسپری اور لاڈارٹی بھی ہو تو مریش کو اس طرح بے یار و مددگار ننگے فرش پہ مرنے کے لیے ڈال دیا جاتا ہے۔

اس وقت اسے کچھ یاد نہ رہا سوائے اس کے کہ وہ ایک ڈاکٹر ہے اور اس کے سامنے ایک ایسا مریض ہے جیسے مریضوں کے لیے اس نے فیروز ہاسپتال بنانے کا خواب دیکھا

ہے، شیخ زائد ہاسپتال میں محمود غزنوی کو وہ جانتا تھا جو اس کے ساتھ لندن میں ہوتا تھا وہ وہ بچی کچی سانس لیتے اس نڈھال سے وجود کو وہیں لے گیا۔ محمود کے دماغ میں بھی موت سے لڑنے کا سودا سمایا تھا۔ اس نے ایک چیٹنج کی طرح اس مریضہ کو قبول کیا جس کا کینسر لاسٹ اسٹیج پہ تھا اور جو دل کے انتہائی شدید دورے کے بعد کوئی مناسب طبی سہولت میسر نہ ہونے کے بعد بھی زندہ تھی اور اسے مزید کچھ دن بھی زندہ رکھنا ایک امر دشوار تھا، لیکن شاید خدا نے اس کی عمر بڑھا رکھی تھی، یا اس کے حصے کے کچھ مزید تماشے دیکھنے رہتے تھے کہ خوشنود اور محمود کے اندر کے ضدی ڈاکٹر تھک کے ہار نہ مان رہے تھے۔

سینٹ پور جانا ہاسپتال کے دیگر معاملات، خوشنود کو کچھ بھی نہ یاد رہا۔ رہی وہی کسر اتفاقاً سمیٹنے والی مقدس نے پوری کر دی۔ وہ اپنی زندگی کے اس نئے اور خوش کن موڑ پہ حد سے زیادہ حیران تھا۔ ابھی تو وہ دل میں بیٹنے والے نئے نئے سببانے سے جذبے کو محسوس کرنے کی کوشش ہی کر رہا تھا ابھی تو وہ آنکھوں کی پتلیوں میں ڈولتے اس عکس کے رنگ بھی نہیں گن پایا تھا کہ یہ ایک جھٹکا ...

اس کی ذہنی رو پھر سے چند منٹ پہلے ہاسپتال میں پیش آنے والے واقعے کی طرف

”مما.....!“ یہ ایک لفظ اسے خود سے کتنی دور لے گیا تھا جو کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی

اور اب وہ اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا تو اسے پانا کتنا سہل لگتا تھا۔

یہ تو ٹھیک ہے کہ بدلے اور انتقام کی تیش اس کے دل تک نہیں پہنچ پائی۔ یہ بھی درست کہ اس کی سیمائی کی طرف مائل فطرت کسی کا خون بہانے کا سوچ بھی نہیں سکتی اور یہ بھی ایک حقیقت کہ ماں کی تربیت اور اعلیٰ تعلیم نے اسے عداوت و حقارت کے جذبے سے کوسوں دور ہی رکھا لیکن پھر بھی ... پھر بھی کیا وہ اپنے اندر یہ تسلیم کرنے کی ہمت پاسکے گا کہ وہ اپنی باپ کے قاتل کی بیٹی سے محبت کرنے لگا ہے۔ ”نہیں ہرگز نہیں۔“ اس نے زور زور سے انگلی میں سر ہلایا۔

”میں کچھ بھی کر لوں اتنا اعلیٰ ظرف تو کبھی نہیں ہو سکتا۔“ اس نے خود سے ہار مان

URDU-PHOTO

کر کر کے اس نے یہ اٹکوا ہی لیا کہ ڈاکٹر خوشنود علی، فیروز وردگ کا بیٹا ہے، اس فیروز وردگ کا جس کے بے لوث دوستی کے قصیدوں سے اس کے بابا جان کی ڈائری بھری پڑی ہے اور اس فیروز وردگ کا بیٹا جس کے ذکر سے اس کے گھر میں سناٹا چھا جاتا ہے۔ جس کے نام کی وبشت سے بی بی جان اور تاجا جان اپنے لاڈلے زریاب خٹک کی خیر مانگتے ہیں۔

”واٹ، ہاؤسر پرائزنگ، کتنا افسانوی سا لگ رہا ہے۔ یوں سچ در سچ اتفاقات کی کڑی ملتے جاتا۔ اس سے تو صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ قدرت خود تمہاری رہنمائی کر رہی ہے، وہ خود ان رازوں کو تمہارے سامنے کھولنا چاہتی ہے اور تم بے وقوف یوں منہ اٹھائے۔ واپس چلی آؤ میں تمہارا تو ماں کی تلاش میں ڈیوانی ہو رہی تھیں اور کہاں ان کے ملتے ہی سب چھوڑ چھاڑ یہاں اندھیرے میں آنسو بہاتے میں لگن ہو۔“

”تو کیا کرتی تھیں جانتی ہوں اس امر کے پردے میں میرے لیے کوئی خوش کن انکشاف نہیں ہے۔ کاش ماما مجھے ملتی ہی نہیں یا پھر..... یا پھر وہ مجھے زندہ نہ ملتیں۔“ اس نے بے رحمی سے کہا۔

”کیا بکواس کر رہی ہو؟“

میں سچ کہہ رہی ہوں۔ بابا کی ڈائری نے میرے ذہن میں ان کا ایک پیکر تراش دیا تھا۔ انداز بھر کی باتوں کو نظر انداز کر کے میں نے انہیں ہمیشہ ہی اپنے تصور میں ایک اور دنیا کی حیثیت سے سوچا۔ لوگ کیا کہتے ہیں مجھے کبھی اس کا یقین نہ آیا۔ اس کے شاہوکاروں نے جو سارے زمانے سے کٹ کر... اولاد اور شوہر کو بھلا کر زندگی کے اس انتہائی مہذبہ آج اگر کوئی ان کے پاس ہے تو اسی شخص کا بیٹا جس کا نام ان کے ساتھ اتنی ذلت کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ میں ڈرتی ہوں شہزاد کہ کہیں یہ سب سچ ثابت نہ ہو جائے۔“

”خواتنواہ کے اندیشے ہیں تمہارے دل میں، میری یہ بات یاد رکھو مقدس زریاب کہ ادھر اور اہم ہمیشہ تکلیف دیتا ہے۔ اگر تم اس سچی بات کو دال ہی چکی ہو تو اب اس کے تمام سرے سجھانا تم پر فرض ہے۔ اب سچ چاہے جو بھی نکلے اسے ہمت اور جوصلے کے ساتھ قبول کرو۔ لیکن پہلے سچ کی تلاش تو کرو ہو سکتا ہے سچ اس سے بالکل مختلف ہو جو تمہیں دکھائی دے رہا ہے۔ اب تک ایسا کتنا کچھ ہو چکا ہے جو تمہاری توقعات کے بالکل

کے اپنی کمزوری تسلیم کی۔ ٹرن..... ٹرن فون کی بیل پہ اس نے اپنے حواس مجتمع کیے، دوسری جانب ڈاکٹر محمود غزنوی کی پر جوش آواز تھی ”خوشنود علی، مجزہ ہو گیا..... میں اسے تجزہ ہی کیوں گا۔ تمہاری پیشہ موت خاتون آج آئی۔ سی یو سے پرائیویٹ روم شفٹ کر دی گئی ہے۔ انہیں ہوش آ گیا ہے۔ میرے خدشے کے برعکس وہ کوئے میں نہیں گئیں اور نہ ہی ان کی ذہنی حالت کو کوئی فرق پڑا ہے تم چاہو تو ابھی ان سے مل سکتے ہو۔“

نڈھال سا پڑا خوشنود نئے سرے سے بے عزم ہو گیا۔ وہ یہاں ایک مرقی ہوئی عورت کی آخری خواہش پوری کرنے آیا تھا، لیکن قدرت نے اسے سالوں سے سربستہ رازوں سے واقف ہونے کا موقع فراہم کر دیا۔ وہ اس موقع کو گنوا نہ چاہتا تھا۔ چند ہی منٹوں میں وہ اس کے روبرو تھا۔

وہ اپنے کمرے میں گھنٹوں میں سردیے زار و قطار دے گئے جا رہی تھی اور شاہزاد سے خاموش کرانے کی ہر کوشش میں ناکام ہو کے اب خود رو دیے والی ہو رہی تھی۔ ”مقدس، اپنی جان لے لوگی تم یوں رہو گے۔ آخر بتاتی کیوں نہیں کیا ہوا؟ کہاں گئی تھیں تم؟“

”میں ہسپتال گئی تھی شانو اور..... اور وہ میری ماما ہی ہیں۔ اس نے بدقت چند الفاظ کہے اور پھر سے پچکیاں بندھ گئیں۔“

”وہ ہی میری ماما ہیں..... میں فوراً پہچان گئیں انہیں دیکھتے ہی۔ وہ مجھے دیکھنے نہیں دیتیں۔ اور نہ شاید وہ بھی مجھے پہچان لیتیں، لیکن نہیں..... پہچانتے تو انہیں پہچان لیتیں۔ وہ بھلا کہاں یاد رکھ پائی ہوں گی کہ ان کی ایک بیٹی بھی ہے۔“

”کیسی باتیں کر رہی ہو؟ اگر وہ تمہاری ماں ہیں تو پھر..... خیر یہ بتاؤ ڈاکٹر صاحب کیسے جانتے ہیں اماں مومنہ..... میرا مطلب ہے آئی کو۔؟“ اس کے سوال کے جواب میں وہ چپ رہی۔

کچھ اندیشے تھے جو اسے کمل کے ماں کے ملنے کی خوشی بھی نہ منانے دے رہے تھے۔ وہ ان خدشات کا اظہار کر کے اپنی ذات کو کسی کی نظروں میں بے وقعت نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن مقابلہ شاہزاد بھی جو اس کی تہہ سے بھی اصل بات کھون لاتی۔ مسلسل سوال

برخلاف ہے۔ پھر اب ایسا کیوں نہیں ہو سکتا؟ خود سے ہی منہی انجام فرض کر کے بیٹھ جانا حماقت ہے اور ماں جیسے رشتے پہ بغیر کسی واضح ثبوت کے اتنی بدگمانی سراسر گناہ ہے۔“ اس کے سمجھانے بجھانے پہ وہ پھر سے نئی حقیقتوں کا سامنا کرنے پہ تیار ہوئی۔

☆☆☆

”فیروز لالہ.....“

دھندلائی ہوئی آنکھوں سے سامنے موجود اونچے لمبے سراپے کو دیکھ کے اس کے لبوں سے سرسرا تا ہوا نام نکلا۔ ہوش میں آنے کے بعد یہ پہلا مانوس چہرہ تھا جو اس نے دیکھا اور جسے دیکھتے ہی اسے احساس ہوا کہ شاید ہوش میں وہ اب بھی نہیں آئی ہے۔ یعنی سے پلکیں جھپک کے اس نے دوبارہ غور کرنے کی کوشش کی، وہ چہرہ اور قریب آئی۔

”میں خوشنود علی ہوں اور میری ماں نے کہا تھا کہ میں پھوپھو کو پھوپھی دیا گیا ہوں۔“

پکاروں۔“ بیڈ کے کنارے بیٹھ کے اس نے آہستہ آہستہ میں کہا تو اسے یقین آ گیا کہ وہ واقعی ہوش میں ہے۔ ڈرپس لگے تا تو اس باتھ اٹھا کے اس نے اس چہرے کو چھونا چاہا۔

”خوشنود..... اتنا بڑا..... کتنا وقت گزر گیا..... آہ“ اس کی ہلکی بھوری شہد رنگ آنکھوں کے گوشوں سے چند آنسو پھسل کے اس کے الجھے بالوں میں جذب ہو گئے۔

دھندلائی آنکھیں مسکرائیں۔

”تو تمہیں لالٹی نے بھیجا ہے۔ میں نے اس سے کیا مانگا تھا اور اس نے کیا بھیج دیا۔ تم نے میری سزا اور بڑھادی ہے لالٹی۔ مجھے زندگی نہیں چاہیے تھی۔ مجھے چار پھولوں اور ایک عدد نائے مغفرت کی حاجت تھی تم نے تو سب کچھ دیا۔“

اس کا لہجہ حد درجہ صاف تھا۔ خوشنود کو حیرت ہوئی اس کی آوازوں سے تعلق رکھنے کے باوجود اتنی رواں اور شستہ اردو..... شاید لاہور اتنا عرصہ رہنے کی وجہ سے ہے۔

”میں آپ سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں پھوپھو جان۔“ منہی بھر ہڈیوں والا یہ بے بس وجود خود بخود اسے ٹکریم کرنے پر مجبور کر رہا تھا۔

”آہ..... میں جانتی تھی کہ زندہ رہی تو ضرور کوئی نہ کوئی کچھ پوچھنے والا آئے گا۔ لیکن میرے پاس بتانے کو کچھ بھی نہیں، میں تو اب تک یہ بھی نہیں جان پائی کہ پھولوں کے رنگ کالے کیسے ہو جاتے ہیں۔ تمہیں کیا بتاؤں۔“ اس کی ذہنی رونجھانے کہاں بھٹک گئی۔ وہ کچھ

نہیں سمجھا پھر کچھ لمحے رک کے پھر سے اپنا سوال دہرایا۔

”میں نہیں جانتا کہ خود کو چھپا کر رکھنے میں آپ کی کیا مصلحت تھی، لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ آپ کے سینے میں چھپے چند حقائق بہت سی زندگیوں کو بھٹکنے سے بچالیں گے۔ سالوں سے یہ سوال مجھے بے چین کیے ہوئے تھے۔ مختلف لوگوں کے پاس اس کے مختلف جواب تھے میں صرف سچ جانتا چاہتا ہوں۔ فیروز علی کا بیٹا ہونے کے ناتے مجھے اتنا حق تو ہے نا۔“ اسے بولنے پہ آمادہ دیکھ کے خوشنود نے مزید کہا۔

”سب ڈاکٹرز کہتے ہیں کہ آپ کا سچ جانا ایک معجزہ ہے لیکن میں جانتا ہوں کہ یہ معجزہ صرف اس لیے رونما ہوا ہے کہ آپ سچائی کو دنیا کے سامنے لاسکیں۔“

”اب ہر سچ بتانے والے کے لیے نہیں ہوتا۔ کچھ سچ کڑے گھونٹ کی طرح پی جانا پڑتے ہیں۔“

”نہیں، کڑواہٹ کو پی جانا دانشمندی نہیں۔ آسے تھوک دینا چاہیے۔“ خوشنود نے کہا۔

☆☆☆

وہ کمرہ جو عرصے سے موت کی آہنیں سن رہا تھا ایک بیک چہکاروں سے گونجنے لگا۔ خان ب خنک کا اجزا ہوا بیمار کمرہ آج آباد تھا۔ ان کا بلڈ پریشر تخت جگر کو سامنے پا کے خودی اور موت سے بلندی کو چھو رہا تھا۔ بوڑھا جھریوں زدہ چہرہ سرخ ہو کے دکھنے لگا تھا۔

خان ب خنک کی کنتت زدہ زبان کو اور بھی مجبور کر رہی تھی۔ وہ بار بار کچھ کہنے کی کوشش کرتے۔

”باب ب خنک کا ہاتھ نم لبوں سے چوم کر رہ جاتا۔ ہر بار اس کی آنکھوں میں آنسو کے خواستگار چند پشیمان سے آنسو ان کے ہاتھ تر کر دیتے۔“

خان ب خنک کی بی بی کے چہرے سے وہ گھبراہٹ مفقود تھی جس نے گزشتہ کئی دنوں سے ان کا احاطہ کیا ہوا تھا۔ خان انفراسیاب اور خان دراب سرخرو سے کھڑے باب بیٹے کے والہانہ لمن کو دیکھ رہے تھے۔ نئی نسل کے بہت سے نمائندہ جنہوں نے اپنے ہوش میں پہلی بار خنک فیملی کے بھٹلے بیٹے کو دیکھا تھا، فرط اشتیاق سے گھیرا بنائے کھڑے تھے۔

ان میں خان دراب کی بیگم بھی تھیں، واحد وہ تھیں جنہیں اس موقع پر مقدس کی غیر حاضری بری طرح کھل رہی تھی۔ وہ بار بار زریاب کے چہرے کی جانب دیکھتیں شاید اب وہ اپنی بیٹی کے بارے میں کچھ پوچھیں۔ انوشہ اور پلو شہ کو دیکھ کے اس کی آنکھوں میں

تجسس اور اشتیاق کی ایک لہر آتے ضرور دیکھی گئی تھی لیکن اب باچا جان کی ناگفتہ بہ حالت شاید اس کا دھیان بننے نہ دے رہی تھی۔

”جی باچا جان، کہیے، کیا کہنا چاہتے ہیں، میں آپ کا مجرم ہوں، جو کہنا چاہتے ہیں کہہ دیجئے۔ میں اس سے بھی زیادہ کا مستحق ہوں۔“

لاغر باپ کی بے بسی اور بے چینی محسوس کر کے زریاب نے دونوں ہاتھوں سے انہیں تمام کے خود کو مزاکے لیے پیش کیا وہ باپ کی اس حالت کا سراسر قصور وار خود کو سمجھ رہا تھا۔ باچا جان نے نفی میں سر ہلایا۔

”نہ... میں تم... تمہارا... تمہارا مجرم... بس اس لیے زندہ... تمہارا... معاف کر دو... معافی... معافی...“

یہ ٹوٹے پھوٹے الفاظ تمام افراد کو سزا دے کر گئے شاید باچا جان کی ذہنی کیفیت ناراض نہیں۔ اس کا اندازہ کر کے افراسیاب خشک سے انہیں آرا بھرا ہوا جواب دینے سے بی بی جان اور زریاب کو باہر آنے کا اشارہ کیا۔ لیکن ازیب خشک نے التجا یہ انداز میں بیٹے کا ہاتھ تمام لیا اور منت کے ساتھ اپنی شریک حیات کو دیکھنے لگے۔

”نہ... نہ جاؤ... میں ایسے نہیں مرنا... پہلے یہ بوجھ... موت... آسان کر دو... حنفرتی... خدا کے لیے... حنفرتی...“

بی بی جان کا نظریں چرانا تینوں بیٹوں کو لٹکنے پہ مجبور کر گیا۔ زریاب تو ابھی خود سوچنے سمجھنے کی پوزیشن میں نہیں تھا البتہ افراسیاب نے کسی انہونی کے خدشے سے پیش رو نظر بچوں اور خواتین کو باہر جانے کا حکم یہ اشارہ دیا۔ تالی جان سب کو لے کر خانہ نشین گھر سے نکل گئیں۔ بی بی جان لرزتی ٹانگوں پہ ہاتھوں سے تکیے لگا کر بیٹے کے پاس پہنچ گئیں۔

”باچا جان کیا کہنا چاہتے ہیں بی بی جان؟“ خان افراسیاب خشک کے لہجے میں کچھ تھا جو حنفرتی بی بی کے سرخ و سفید چہرے پہ زردی چھا گئی۔

”حنفرتی... بتا دو... تم... تم کو اللہ کا واسطہ... یہ اولاد... کا بھلا گناہ... گناہوں کا کف... کفارہ... سب بتا دو... اب تو سب... کچھ... بتا دو... بولتے بولتے وہ ہانپنے لگے۔ اچانک بی بی جان دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ کے رونے لگیں۔ زریاب مچل کے اٹھا۔

”بس کریں بی بی جان... خدا را یوں مت روئیں اور آپ لالہ... آپ بھی...“

بس... باچا جان بیمار ہیں... کمزور ہیں ہم نہیں جانتے وہ کیا کہنا چاہ رہے ہیں آپ بی بی جان پر تو دباؤ مت ڈالیں وہ پہلے ہی پریشان ہیں۔“

”نہیں زریاب، میں پریشان نہیں، پشیمان ہوں... خان جی ٹھیک کہتے ہیں کم از کم اب تو... زندگی کے ان آخری دنوں میں اب تو مجھے سچائی سب کے سامنے لے آئی چاہیے۔ کاش میں نے پہلے ہی ان کی بات مان لی ہوتی تو اتنا کچھ نہ کھونا پڑتا۔ اک ذرا کچھ بچانے کے لیے میں نے سب کچھ داؤ پر لگا دیا۔ اپنا گھر، تمہارا گھر، تمہیں، خان جی کو... اب بھی شاید میرے بتانے سے کچھ بچ جائے میرے پاس نہ سکی تمہارے پاس ہی سکی۔“

ان کی نظریں لینے کے سامنے جھکی ہوئی تھیں۔

”بی بی جان... میں بہت شکستہ ہو چکا ہوں... کچھ تاب لانے کی مجھ میں مزید ہمت نہیں رہی یہ دل اب اور کوئی گھاؤ سہہ سکتا ہے۔ مجھے مزید مت الجھائیں میرا دماغ پھٹ جائے گا۔ جو کہنا ہے صاف صاف کہیں۔“

☆ ☆ ☆

”میرا سب سے پہلا رشتہ اجنبیت کا تھا۔“ مومنہ نے بتانا شروع کیا۔

”سب سے پہلے جو احساس میرے دل میں جاگا وہ اجنبیت کا تھا۔ جو فضا میرے آس پاس موجود تھی وہ اس فضا سے الگ تھی جس کی باس مجھے اپنے باپ سے آتی تھی۔

میں نے اس میں مجھے کھٹے یاد کراتا تھا جو اس زبان سے الگ تھی جس میں میری ماں بولتی اور میں سمجھتی تھی۔ سنے گرد و پیش سے یہ اجنبیت اور بڑھ گئی جب بہت پہلے میری انتقال ہو گیا میرے باپ کے گھر سے گھر اپنا دائرہ اور محدود کر دیا وہ مجھے اجنبی ہواؤں،

میرے ماں کالاش کے پہاڑوں کی رہنے والی تھی، کافر قبیلے سے تعلق تھا اس کا اور میرا باپ پنجاب سے تعلق رکھتا تھا، اپنی جوانی میں لاہور سے کلام گھومنے آیا اور میری ماں کا اسیر ہو کے بیٹس کا ہو رہا۔

یہ واہی پیار محبت کے متوالوں کے لیے بڑی سازگار ہے۔ دیوار نہیں بنتی فقط چند پابندیاں لگاتی ہے۔ میرے باپ نے یہ پابندیاں قبول کر لیں جو اس وقت اسے بہت سہل معلوم ہوتی تھیں لیکن میری پیدائش سے وہ سہم گیا اس کے اندر کا مسلمان باپ نگر مند

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

ہو گیا۔ وہ ہر وقت مجھے کافر رسم و رواج سے بچانے کی سعی میں لگن رہتا۔ میری ماں کی موت نے اس کے لیے واپسی کی راہ کھولی لیکن نجانے وہ کون سی نادریدہ بیڑیاں تھیں جنہوں نے اس کے ہیرہ بمبوری کی وادی سے باندھ دیئے تھے۔

میں اس وادی میں رہتے ہوئے بھی سب سے الگ تھی۔ سب سے کٹ کے رہنے میں جوازیت ہے اس کا مزاج آج سے نہیں لے رہی یہ تو میرے بچپن کا تجربہ ہے۔ تنہائی نے ایک نشے کی طرح ایک لٹ کی طرح مجھے جکڑ لیا۔ یہ تنہائی تب اور تکلیف دہ ہو گئی جب ابا بھی مجھے چھوڑ کے چلا گیا اس کے بس میں ہوتا تو وہ کبھی نہ مرتا۔ آخری دنوں میں ہی اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا اور مجھے یہ شرمندگی کہ محض میری ذات کی وجہ سے ابا اپنے ہوش کو غلطی کہنے پہ مجبور ہو گیا۔

مجھے اپنے آپ سے نفرت محسوس ہوتی صرف میری وجہ سے اسے ازل و ازل سے یہ دہا۔

ابا پچھتا رہا تھا کہ ماں کے مرنے کے بعد وہ کیوں نہ مجھے لاہور لے گیا۔ شاید اس کے رشتے دار بھی مجھے تسلیم نہ کرتے لیکن ابا کو یہ اطمینان تو رہتا کہ وہ کلمہ گو لوگوں میں اپنی بیٹی چھوڑے جا رہا ہے۔ میرے ہر طرح سے یہ یقین بگاڑنے والے نہیں ہر حال میں اسلام پہ قائم رہوں گی کسی کافر سے شادی نہیں کروں گی، ابا کے سلوں سے آئیں موندیں بعد میں مجھے لگا ابا کے خدشے تقریباً بے بنیاد تھے، بستی کے لوگ جاہل تھے، کافر تھے، جنگلی تھے مگر پیارے تھے۔ جو پیار کرتے ہیں انہیں پیارے ہی کہا جاتا ہے ناں۔ کسی نے میرے ایمان کو ٹھیس نہیں پہنچائی۔

میں اجنبیوں کے درمیان بھی بڑی سہولت سے زندگی گزار رہی تھی کہ ایک دن وہ آیا جسے پہلی نظر دیکھ کے ہی مجھے سالوں سے روز فجر سے تا آنگی اپنے دعاؤں کے پورا ہونے کا یقین آنے لگا۔ وہ زریاب تھا۔ جس نے ابا کی قبر پہ فاتحہ پڑھ کے مجھ سے اپنا رشتہ اور رکا لیا۔ میں اسے چاہنے لگی ویسے ہی جیسے کوئی بھی کسی کو چاہ سکتا ہے۔ بغیر کسی طلب کے، بغیر کسی چاہ کے، بغیر کسی منسل کے..... میں اسے چپ چاپ چاہتی رہتی تا عمر، چاہے وہ چاہتا یا نہ چاہتا، چاہے یہاں رہتا چاہے چلا جاتا۔ مجھے کوئی فرق نہ پڑنے والا تھا۔ لیکن ایک عجیب سی بات ہوئی اسے بھی مجھ سے چاہت ہو گئی۔ لیکن یہ ویسی چاہت نہ تھی جیسی کسی کو بھی کسی سے ہو جاتی ہے۔ یہ ایک ضدی خان زادے کی چاہت تھی جو ہر من چاہی چیز کو اپنا

دیکھنا چاہتا ہے۔

میری محبت ایک بنجارن محبت تھی، عاجز، مسکین، ہر حال میں راضی خوشی رہنے والی صابر شاکر محبت اور اس کی محبت نوابی تھی، جلالی تھی، طوفانی تھی سب بہا کے ساتھ لے جانے والی۔ اسے اس بات سے فرق پڑتا تھا کہ میں اس کی ہو کے رہوں یا اس وادی کی۔ یہ فخر مجھے اونچا کر گیا لیکن میں کم ظرف نہ تھی اپنے ابا کا حشر دیکھ چکی تھی۔ مرتے دم بھی اس کی آنکھوں میں جو پچھتاوے تھے اس نے مجھے محتاط کر دیا تھا اور میں نے عشق اور ذہن کو الگ الگ رکھنے کا فیصلہ کر رکھا تھا لیکن زریاب کے لیے عشق ہی سب کچھ تھا، عشق ہی تھا، عشق ہی آس، عشق ہی زندگی اور عشق ہی موت، وہ دصال کے بغیر عشق کو سوچنے کا

اس نے مجھے شادی کی پیش کش کی۔ میں چاہتی تو ایک جست لگا کر اس اجنبی دنیا سے نکل سکتی تھی لیکن میں نے اور بھی بہت کچھ سوچا۔ اگر میں زریاب کو اپنے ابا کی طرح یہاں رہنے پر مجبور کرتی تو ایک بار پھر وہی کہانی دہرائی جاتی۔ میں جانتی تھی وہ اپنے عشق اور طلب میں اتنا دباؤ تھا کہ عیش و آرام ترک کر کے میرے پاس پہاڑوں پہ بنے لکڑی اور گاوٹوں کے مکان میں زندگی گزارنے پہ تیار ہو جاتا لیکن میرا عشق اپنی ماں کی طرح خود غرض نہ تھا۔

میں جانتی تھی چند سال بعد اپنے خون کے رشتوں سے جدائی اسے ابا کی طرح ادھورا انسان، ہندسے کی اور میں جانتی تھی کہ اس کی دنیا میں میرے لیے کوئی جگہ نہ ہوگی۔ اس کے دل پہ تو شاید میں حکمرانی کر لوں لیکن اس کے گھر میں مجھے ایک ان چاہے فرد کی حیثیت ہی حاصل رہے گی۔ مجھے اپنی انا اور ذات کا غرور ہمیشہ بہت عزیز رہا ہے۔ ان سر بلند پہاڑوں اور اونچے پیڑوں کی سنگت نے اپنی ہی خوشبو پیدا کر دی تھی مجھ میں، مجھ سے کسی کی نیرھی نظرس برداشت ہوتی تھی نہ ہی کسی کی انٹھی انگلی۔ مجھے اکیلا رہنا منظور تھا لیکن کم حیثیت زندگی نہیں۔ میں محبت کے بدلے رسوائی اور بے عزتی قبول کرنے پہ تیار نہیں تھی۔

میں نے اس سے شادی سے انکار کر دیا کیونکہ میں جانتی تھی وہ صرف مجھے محبت دے سکتا ہے اپنے اعلیٰ نسب گھرانے سے وتار نہیں دلواسکتا۔ بے توقیر ہو کے رہتا مجھے منظور نہیں تھا اس لیے اس کی ہر درخواست میں نے رد کر دی۔ حتیٰ کہ ایک دن اس کا عزیز دوست

فیروز اس کی حالت برداشت نہ کرتے ہوئے مجھے سمجھانے چلا آیا۔ بڑے ہی واوے اور اپنائیت کے ساتھ وہ اپنے دوست کی دکالت کرتا رہا لیکن میرے نقطہ نظر واضح کر دینے کے بعد ایک دم چپ ہو گیا۔ مجھے لگا جو بات زریاب کو سمجھانے میں ناکام رہی، وہ بات فیروز سمجھ گیا ہے۔ میں نے اسے مزید قائل کرنے کی کوشش کی۔

”آج اجنبی لوگوں کی یہ بستی میری سرپرست تو ہے میں اسے چھوڑ کے زریاب کے ساتھ چل پڑوں تو بالکل ہی لاوارث اور بے سائبان کبلادوں گی۔ زریاب کے دنیا میں صرف میں اور وہ ہی نہیں ہوں گے اس کا پورا خاندان ہوگا۔ اس بھری پری دنیا میں اپنی جگہ کس بل بوتے پر بناؤں گی۔ مجھ سے بھاننا آسان ہے لالہ رشتے بھاننا مشکل ہے، میں زریاب کو کسی مشکل میں نہیں ڈالنا چاہتی اور مجھ سے کوشش اور کوششوں سے جسے سامنے لینے کے لیے بھی عزت کی ضرورت ہے، عزت میری ہے اللہ، وقار میری پیاس ہے، محبت صرف عادت، عادت اور ضرورت کے پر پر ہا جا سکتا ہے جھوک اور پیکس سے کوئی کتنی دیر لڑ سکتا ہے۔ میں کم فہم یا خوش فہم نہیں، میں جانتی ہوں میں ایک حقیر بے مایہ سی پہاڑن ہوں اور زریاب کے مقابلے میں تو بالکل ہی کم فہم نہیں لیکن کہا ہے ضروری ہے کہ زندگی کے ہر قدم پر مجھے اپنی کم مائیگی کا احساس دلانا پڑے۔ میں جہانگیر کی حیثیت رکھتی ہوں میں بہت خوش ہوں۔ یہ لوگ مجھے جانتے ہیں میری ماں کو، میرے باپ کو، میری اور میرے خاندان کی تعظیم کرتے ہیں میں پورے وقت کے ساتھ اس بستی میں بغیر کسی دلی وابستگی، خون رشتے اور محبت کے زندہ ہوں لیکن وہاں زریاب کی عالی شان حویلی میں مسکا کس حیثیت سے داخل ہوں گی۔“

”فیروز علی وردگ کی بہن کی حیثیت سے۔“ اس کے فیصلہ کن انداز نے مجھے حیرت زدہ کر دیا اور ابھی میں سمجھنے نہ پائی تھی کہ اس کا مضبوط ہاتھ میرے سر پر ٹھہر گیا۔

”تم نے جتنی بھی بار مجھے لالہ کہہ کر پکارا مجھے خود پہ خبر محسوس ہوا ہے مومنہ۔ زریاب سے تمہارے متعلق بہت کچھ سنا تھا۔ لیکن خود تم سے مل کر احساس ہوا کہ تم کیسا نایاب گوہر ہو۔ جو عورت محبت پر عزت کو ترجیح دیتی ہو۔ جو آسائشات سے بھری زندگی محض وقار کے لیے ٹھکرا دینے کا حوصلہ رکھتی ہو۔ اس عورت کی عزت بھی کی جاسکتی ہے۔ آج اس لمحے میں نے اپنے دل میں تمہارے لیے بے پناہ عزت و احترام محسوس کیا ہے اتنا کہ جتنا میرے دل میں اپنی ماں کے لیے ہے۔“

اس کی انتہا پسندی مجھے ہواؤں میں اڑانے لگی۔

”لیکن تم مجھ سے چھوٹی ہو اس لیے میں تمہیں بہن کہوں گا۔“

”لالہ.....! سسکیوں کے درمیان میرے منہ سے فقط اتنا ہی نکل سکا۔ اس کا ہاتھ میرے سر پہ ہنوز آسمان کی طرح سایہ کیے ہوئے تھا۔ ابا کے بعد زریاب وہ واحد شخص تھا جس سے لگاؤ اور انسیت سے بڑھ کے کچھ محسوس کیا تھا میں نے، جس کی محبت کو پور پور اتار کر میں شانت ہو گئی تھی لیکن رشتہ اور مان محبت سے کہیں بڑھ کے طمانیت بخش ہوتا ہے یہ مجھے اب اندازہ ہوا۔ فیروز نے مجھ سے یہ مقدس رشتہ جوڑ کے مجھے معتبر کر دیا تھا۔

”اور ایک بھائی ہونے کے ناطے میں یہ فیصلہ سزا ہوا کہ تمہارا نکاح آج ہی خان زریاب کے ہاتھ کر دیا جائے گا لیکن اس سے پہلے کہ تم میری نیت پہ شک کرو میں یہ واضح کر دیتا ہوں کہ تم کا گھر میرے ساتھ میرے گھر چلو گی۔ زریاب کے والدین میرے پاس آکر باقاعدہ تمہارا رشتہ طلب کریں گے اور میں ایک باپ کی طرح اپنے گھر سے تمہیں رخصت کروں گا۔“ اس نے بڑے استحقاق سے فیصلہ سنایا۔

میں نے یہ عہد کرنا ہوا کہ میرا گھر تمہارے لیے ہمیشہ میسے کی طرح آباد رہے گا اور مجھے میں رہوں گا۔ اس گھر سے تمہیں میسے کا تمام تر مان اور وقار ملے گا۔ تمہارے نام کے ساتھ اب فیروز علی وردگ کا بھاری بھرم حوالہ ہے۔ تم زریاب خٹک کے گھر کم حیثیت اور ان چاہتے ہو کہ وہ کی حیثیت سے داخل نہیں ہوگی۔ یہ میرا، ایک خالص خون رشتہ کا عہد ہے۔

اس نے میری ماں اپنے عشق میں اتنی چکی تھی کہ موت کو گلے لگا بیٹھی لیکن جیتے جی ابا کے لیے اپنے رشتے داروں کو چھوڑنے کا حوصلہ نہ کر سکی اور میں زریاب خٹک کے لیے اپنے محبوب کے لیے اتنی بے لوث ہو کر سوچتی تھی کہ خود کو تباہ کر لینا منظور تھا، اسے کسی امتحان میں ڈالنا گوارا نہ تھا، میں ڈرتی تھی میری شدت پسندی اور اتنا پرستی اس کے لیے مسائل کھڑے نہ کر دے اس لیے خود کو محروم کرنا گوارا کر لیا تھا میں نے اور فیروز خان اس کی بار میں کتنی خود غرض بن گئی..... یہ نہ سوچا کہ مجھے تحفظ دینے کا عہد کرنے والا کہیں کسی مشکل میں نہ پڑ جائے۔ اس نے میرا اعتماد بحال کیا اور میں نے بڑی آسانی سے اپنا

ہر اچھا برا اسے سوچ کر خود کو بے فکر کر لیا۔ پھر وہی سب ہوا جیسا اس نے ملے کیا تھا۔
 چند مشکلات کے بعد سب ٹھیک ہو گیا۔ میں چند ہی دنوں میں بیاہ کر زریاب کی
 حویلی آگئی اور پھر وہ دور شروع ہوا جو میری زندگی کا سب سے حیران کن دور تھا۔
 تم جاننا چاہو گے کہ حیران کن کیسے؟ تو وہ اس طرح کہ میرے تمام تر خدشے بھر بھری
 ریت کی دیوار ثابت ہوئے۔ نہیں ایسا نہیں تھا کہ زریاب کے گھر والوں نے مجھے باآسانی
 اور کھلے دل کے ساتھ قبول کر لیا تھا۔ وہاں میرے لیے سرد مہری تھی، اجتناب تھا۔ زریاب
 کی بی بی جان مجھے مسلمان ماننے پہ تیار نہ تھیں وہ اور ان کی خاص ملازمتیں تک باقاعدہ
 مجھ سے کتراتیں۔ کوشش کی جاتی کہ میں اپنے کمرے تک محدود رہوں لیکن چاہتا ہوں
 حیران کن بات کیا تھی... وہ یہ کہ یہ تمام اجنبی اور غریبوں نے بھی مجھے بھڑکانے کی کوششیں
 اس بات سے ڈرتی تھی کہ کہیں سرد رویے مجھے لیے موت کی دیوین برکسی نہ لیا۔ حیران کن
 رہ گئی عجیب کھوئے کھوئے دن تھے۔

مجھے سوائے زریاب کے اور کچھ دکھائی نہ دیا، کچھ سناکی نہ دیتا۔ کون مجھے ہندنی کہہ
 کے رکارتا ہے کون کافر کہہ کر، احساس ہی نہ ہوتا۔ مجھے برتنوں کو ہاتھ لگانے کی اجازت نہ
 تھی لیکن مجھے اس میں بھی کوئی تنگ محسوس نہ ہوتی۔ میری نماز روزے کو ڈھکوسلا کہا جاتا،
 میں پروانہ کرتی، شاید اسی کونشہ کہتے ہیں اور شاید مکھی کے لیے وہ غیر ترقی اور ذلت کہا جاتا
 ہے۔ نشہ چاہے محبت کا ہی کیوں نہ ہو ہمیشہ پستی کی طرف لے جاتا ہے۔ میں جو جوشی
 پیڑوں کی طرح سر بلند اور اکھڑ تھی، وادی کے بادلوں جیسی شفاف تھی، اتنی بے گانگی اور
 ذلت و تحقیر برداشت کرتی رہی، زریاب سے کبھی اک اننا کس کا... اس نے مجھے
 کسی بات کا ہوش ہی کہاں ہوتا تھا۔

میں بخارن تھی تو محبت بھی کشتکول کے سکوں کی طرح گن گن کر کرتی تھی، حویلی میں
 آئی تو مٹھیاں بھر بھر کے نچھا اور کرنے لگی۔ زریاب کی طرح میرا عشق بھی بلا خیز ہو گیا۔
 میں... مومنہ علی جو عزت کو اپنی بھوک اور تعظیم کو اپنی پیاس قرار دیتی تھی۔ اب سانس بھی
 لیتی تو صرف اس لیے کہ نغنائے آتی زریاب کی خوشبو کو اپنی نس نس میں اتار سکوں۔
 زریاب کی دیوانگی بھی جوں کی توں تھی بلکہ جب سے اسے پتا چلا کہ میں ماں بننے والی
 ہوں وہ میرا پہلے سے بڑھ کے دھیان رکھنے لگا۔
 انہیں دنوں زرسا نگہ، زریاب کی بڑی بہن بھی ڈیوری کے لیے میسے آئی۔ میری

اس سے پہلی ملاقات تھی۔ وہ زریاب کو بے حد عزیز تھی اس لیے میں نے بھی بڑی اپنائیت
 کے ساتھ اس سے ملنا چاہا لیکن اس کے رویے میں بھی میرے لیے سرد مہری اور گریز کے
 سوا کچھ نہ تھا۔ وہ جتنے دن رہی مجھ پہ طنز کے تیر تاک تاک کے چلائی رہی۔

بی بی جان کا رویہ ایک خاموش اجتناب تھا لیکن ان کی بی بی کے رویے کا جارحانہ پن
 مجھے کبھی کبھی نشے سے جھنجھوڑ ڈالتا تھا۔ میں نے پھر بھی اس کی تنگ مزاجی اور ترش روی کو اس
 کی صحت کی خرابی پہ محمول کرتے ہوئے نظر انداز کر دیا۔ بچی کی پیدائش کے بعد اس کی
 صحت مزید بگڑ گئی جس کی وجہ سے اس کا میسے میں قیام طویل ہوتا چلا گیا انہی دنوں فیروز
 لالہ کی بیوی لالی بی بی یعنی تمہاری ماں اپنی دیگر رشتہ دار خواتین کے ساتھ مجھے لینے آئی۔
 وہ چاہتی تھی کہ فیروز کی خواہش کے مطابق میرے بچے کی پیدائش میرے میسے میں ہو۔
 اس توجہ و عنایت پہ میں کھلی انہی لیکن زریاب اسے بل بھر کی جدائی مجھے قبول نہ تھی اس لیے
 جانے سے منع کر دیا۔

میری بچی مقدس اسی گھر میں اپنے باپ دادا کے گھر میں پیدا ہوئی۔ اس کا نام اس کی
 پیدائش سے پہلے ہی اس کے باپ نے سوچ رکھا تھا۔ جب وہ پیدا ہوئی تو ہو ہو میری
 تھی۔ زریاب نے کس بے بسی سے کہا تھا۔
 ”اب میں تم سے کہاں تک بچوں گا مومنہ۔ تم کتنے روپ بدل کے مجھے تسخیر کر
 گئی۔“

بلند ہو گیا۔ مقدس نے باپ کی توجہ بانٹ لی تو میرے بھی کچھ ہوش
 لگے اب مجھے زریاب کے علاوہ بھی کچھ نظر آنے لگا۔ میں نے پہلی بار سنجیدگی سے
 بادلوں کے الجھے کو دیکھا اور گریز کو محسوس کیا۔ غیر جانب داری سے سوچتے ہوئے مجھے
 کچھ تصور اپنا بھی نظر آیا۔ میں نے خود کو صرف اپنے شوہر تک محدود کر رکھا تھا صرف اس کی
 محبوبہ کی حیثیت سے یہاں رہ رہی تھی۔ میں نے ایک بہو ہونے کے ناتے خود کو منوانے کی
 کوشش کی ہی نہیں تھی، اگر بی بی جان مجھے کافر سمجھتی تھیں تو مجھے اپنی حیثیت ان پہ واضح کرنا
 چاہیے تھی، اپنی جگہ بنانے کے لیے کوئی قدم تو اٹھانا چاہیے تھا۔ میں نے حقیقت پسندی
 سے سوچتے ہوئے اپنا احتساب کیا۔

باچا جان مہر تھے کہ اس بار بیرونی ملک کا رو باری دورے پہ زریاب ہی جائے جب
 کہ وہ میری اور اب بھی مقدس کی کشش سے بندھ چکا تھا۔ میں نے ہی اسے جانے پہ

آبادہ کیا ایک بیٹا ہونے کے فرائض سے آگاہی دلائی۔ ایسا کر کے شاید میں خود ایک اچھی بہو بننے کی تیاری کر رہی تھی۔ بمشکل وہ جانے پہ تیار ہوا اس کے جانے کے بعد مجھے اپنے فیصلے کی سختی کا اندازہ ہوا۔ اس کے ساتھ نے کتنی تیز دھوپ مجھے تک آنے سے روک رکھی تھی۔ اس کے جاتے ہی جیسے بھانجھڑ جلنے لگے۔ زرسا نگہ کے بلعنے ناقابل برداشت ہوتے چلے گئے، میرے اندر کی انارپرست پہاڑن پھر سے جاگنے لگی۔ اچھی اور قابل قدر بہو بننے کا ارمان کہیں سو گیا اور سمجھوتے کے تمام تر منصوبے دھڑے کے دھڑے رہ گئے۔

زریاب کے ہمراہ وہ تمام رویے جو میں سرسری جان کے چھوڑ دیتی تھی، اب جان کو آجاتے۔ میں نے تک آ کے اپنے کمرے تک محدود رہنا شروع کر دیا۔ یوں بھی گھر میں مجھے کوئی منہ لگانے پہ تیار نہ ہوتا تھا۔ کوئی بی بی جس جیسے دیکھتے ہی دھڑکنے لگتی پڑتیں۔ ملازما میں ان کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے دو درتیں۔ پھر جان اپنے کمرے یا پھر مہمان خانے تک محدود رہتے۔ وہاں پھر کے کمرے میں رہتے تھے ان کے گھر والوں سے میری سرسری سی ملاقات ایک دو بار ہوتی تھی، ان کے رونے میں بھی کوئی خوش آئند جھٹک نہ تھی۔ جب کہ زریاب کے چھوٹے بھائی سے میری کبھی ملاقات ہی نہ ہوئی تھی۔

زرسا نگہ ابھی تک غلیل تھی اور اس کی بد مزگی اور جین غروج پہ تھا۔ پہنچنے پہ پیدا کا شوہر رحیم گل آفریدی اس سے ملنے آتا، ہر بار ہی دونوں میں کوئی نہ کوئی ٹی پیدا ہو جاتی جس میں میرے نزدیک سارا قصور زرسا نگہ کا ہی ہوتا ہوگا کیونکہ رحیم گل بڑا مہذب اور پڑھا لکھا نوجوان نظر آتا تھا۔ وہ ہنس مکھ تھا۔ بھی اور اچھے لڑکے کے خاصا کم عمر بھی۔

مجھے تو پیارے کی قسمت پہ افسوس ہی دیتا تھا ایک تو بڑی عمر کی بیوی، اوپر سے جاہل، بد زبان اور کم شکل بھی۔ پورے گھر میں وہی تھا جو مجھے خٹک خاندان کی بہو والا درجہ دیتا تھا۔ مجھے دیکھ کے تعظیماً کھڑا ہو جاتا، ادب سے سلام کرتا۔ یہی وجہ تھی کہ جتنا میں زر سا نگہ سے بچ کر رہتی رحیم گل کے آنے پہ اس سے خیر دلتی۔ وہ تھا ہی ایسا عزت کرنے والا اور عزت کرانے والا۔

اس دن میں حد سے زیادہ بے زار اور اداس تھی۔ مقدس کو سامانے کے بعد میں نے زریاب کو خط لکھا، پہلی بار میں نے اس سے اس کے گھر والوں کے باروا سلوک کا ذکر کیا۔

زریاب کے خط لکھا

ورنہ اس سے پہلے میری کوشش ہوتی کہ جتنا وقت بھی وہ میرے پاس رہے ہمارے درمیان کسی دوسرے کا ذکر نہ آئے اور تکلیف دہ ذکر تو ہرگز نہیں۔ لیکن اس دن میں نے اپنی ہر تکلیف اس سے بیان کی۔ اپنی تنہائیوں محرومیوں کا ذکر کیا۔ کس کس طرح میری عزت نفس کو ٹھیس پہنچائی جاتی ہے سب لکھا۔ بیرون ملک خط پوسٹ کرنے کے لیے ظاہر ہے کہ پتہ انگریزی میں لکھا جاتا ہے جب کہ کوشش کے باوجود میں لکھا ہوا پتہ لگانے پہ بہو نہ اتار سکی تو خط لے کر رحیم گل کے پاس چلی آئی۔ وہ رات ہی لگی مردت سے آیا تھا۔

”گل لالہ، ذرا یہ انگریزی کا پتہ تو اس لگانے پہ لکھ دو۔“

میں نے لغافہ اور قلم اس کے سامنے رکھا تو وہ سستی سے اٹھ بیٹھا۔ رتجگا اس کی موٹی موٹی آنکھوں سے جھٹک رہا تھا۔ شب خوابی کا لباس بے شکن تھا جس سے ظاہر ہوتا تھا اس نے ساری رات اسی کرسی پہ بیٹھے بیٹھے گزار دی ہے، مجھے اس کی تسخّل حالت پہ افسوس ہوا۔

”کیا ہوا لالہ، طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی تمہاری۔“

”کچھ نہیں بھابھی! بس سفر کی ٹکان ہے اور..... میری قسمت کا ہم سفر ٹکان اتارنے والا نہیں، بڑھانے والا ہے۔“ اس نے انگلیوں سے اپنا ماتھا مسلتے ہوئے کہا رات بھی زرسا نگہ کے کمرے سے کافی دیر تک تلخ و تند جملوں کی ٹکرار سنائی دیتی رہی تھی، میں ان درمیان موجودگی کی وجہ سے نادانف تھی پھر بھی میری تمام تر ہمدردیاں رحیم گل کے پاس تھیں شاید اس کی وجہ میرے اور میری مند کے سرد تعلقات تھے۔

نے اس کا دھیان بنانا چاہا۔

”تھوڑے دنوں پہ اس بات پہ یوں منہ لگانا مردوں کو زیب نہیں دیتا۔“ میں اس نے بھائی کی طرح پیش آتی تھی شاید وہ مجھ سے عمر میں چھوٹا بھی تھا حالانکہ رشتہ میں کا مجھ سے بڑوں والا ہی تھا۔

”ہاں نسوے بہانا تو عورتوں کی عادت ہے نا۔ ذرا کوئی زیادتی ہوئی دریا بہا کے دنیا بھر کی ہمدردیاں سیٹ لیں گی۔ مرد اپنی مردانگی کے زعم میں دل بھی ہلکا نہیں کر سکتے۔“ وہ پھسکی سی ہنسی ہنس کے پتہ لکھنے لگا۔ میں نے یونہی رواداری میں کہہ دیا۔

”تو تم مجھ سے دل ہلکا کر لیا کرو۔ میں بھی تو تمہاری کچھ لگتی ہوں۔ یقین کرو تمہارے دل کی بات میرے دل تک ہی رہا کرے گی۔“

”ہائے اللہ جی، میں برباد ہو گئی..... یہاں تو دل سے دل تک بات پہنچ گئی۔“

URDU-PHOTO

دو تھڑے دروازہ کھلا اور سینہ کو بی کرتی زور سانگہ اندر داخل ہوئی۔ رحیم گل سرخ چہرے کے ساتھ کھڑا دگیا۔
 ”جو اس بند کردور۔“

”ہائے بی بی جی..... آپ بھی مجھے کوس رہی تھیں ناں کہ شوہر کو راضی نہیں رکھ پاتی اس لیے دو منٹ پاس بیٹھنا گوارا نہیں کرتا۔ آئیں دیکھیں ذرا اس کے پاس نہ بیٹھنے کی وجہ خود دیکھیں۔“ اس نے شور مچا کے بی بی جان کو بھی بلا لیا ان کے ساتھ ساتھ دگمہ اور سرحدی جیسی ملازما میں بھی لپک کے تماشا دیکھنے آگئیں۔

”میں کہتا ہوں زور سانگہ، زبان قابو میں کر لو ورنہ.....“
 رحیم گل نے دھاڑ کے کہا لیکن اسے ذرا پروا نہ تھی۔
 ”اسی لیے بہانے بہانے سے لڑتے کمرے سے نکل رہا ہے۔“
 جادوگر نے جو آبا د کیا ہوتا ہے۔“
 میں سن ہوگئی۔ اس ریک انعام نے میری توجہ سے بھائی ہی لپک رہا تھا۔ وہ زہر اکتی رہی۔

”آدمی رات کو میں نے خود اسے بن ٹھن کے اس کمرے سے نکلے دیکھا تھا۔
 طبیعت بھری نہیں جو چند گھنٹے بعد پھر سے اندر گھس گئیں۔ میرا دل چاہ رہا تھا اس کا منہ نوچ لوں لیکن قدم سن من بھر کے ہو کر زمین سے اٹھ نہ پار چہرے رحیم گل بھی بیوی کے سفید جھوٹ پہ بکا بکا رہ گیا۔

”نہ بی بی ساری رات میں خود زریاب دہن کے پاس تھی۔ بچی کو بخار آ رہا تھا،
 بی بی تو بی بی تک نہیں کمرے سے۔“ سرحدی نے خوف خدا سے لڑنے کے بہانے دیے۔
 ”تو بڑھی چڑیل۔“ زور سانگہ نے کمر بیدہ لیا جو جھپک لیا۔
 نوحے ہوئے وہ بے تماشا چنچنے لگی۔ بی بی جان بی کی دیوانگی پہ ہراساں ہو گئیں۔ اس کی آنکھوں کی پتلیاں چڑھ چکی تھیں، بدن پہ لرزہ طاری تھا اور منہ سے کف بہ رہا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ اپنے حواسوں میں نہیں ہے لیکن پھر بھی مجھے اس سے ہمدردی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے اس سے گھن محسوس کر کے منہ پھیر لیا۔

”دگمہ..... اسے سنبھالو..... نجانے کیسا دورہ پڑا ہے بچی کو جب سے بیاہ ہوا ہے کلا کے رہ گئی ہے نجانے کیسا کسی نے تعویذ پھونکا ہے بیزہ غرق کر کے رکھ دیا ہے دگمہ بچی کا۔“

”بہنو بہ معصوم بچی.....“ رحیم گل نے تنفر سے کہا اسے بی بی جان کا بیٹی کے لیے یوں فکر مند ہونا بالکل پسند نہ آیا، انہوں نے داماد اور بہو کے یوں بے عزت ہونے پر ایک لفظ تک نہ کہا اور کچھ کہا بھی تو بیٹی کے لیے۔

”دورہ نہیں پڑا..... ذرا سے کرتی ہے پاگل پن کے۔ تاکہ جو مرضی آئے کرتی پھرے کوئی کچھ کہہ نہ سکے کہ بیچاری پاگل جو ہے۔“ رحیم گل نے غصے سے کہا۔
 ”میں پاگل ہوں؟ میں پاگل نہیں ہوں تم مجھے پاگل کر دو گے؟“

”میری بچی پاگل نہیں رحیم گل۔“ بی بی جان نے سخت لہجہ میں کہا۔ رحیم گل اس پاس بڑی چیزوں کو ٹھوکر مارتا غصے سے کمرے سے نکل گیا۔ میں کسی بے جان چیز کی طرح کونے کی دیوار سے سہنی چپکی کھڑی تھی۔ یہ تماشا میرے گمان سے بھی باہر تھا۔ زور سانگہ کی کمر چڑکتی تھیں مجھے عجیب سی لگا کر تھیں لیکن وہ اس حد تک جنونی بھی ہو سکتی ہے مجھے اندازہ نہ تھا۔ اس نے تو شوہر کے ساتھ ساتھ مجھے اپنے بھائی کی عزت کو بھی دو کوڑی کا کر دیا۔

غم و غصے نے مجھ سے اتنی ہمت بھی چھین لی تھی کہ میں بھی رحیم گل آفریدی کی طرح اس کمرے سے نکلنے کا سوچتی اور شاید میری بد قسمتی تھی کہ میں اس کمرے میں موجود تھی۔ زور سانگہ نے نفرت سے مجھے دیکھا اور اپنا آپ چھڑا کے مجھ پہ چھٹی۔ اس نے میری چادر پھینک دی اور گریبان سے پکڑ کے مجھے زمین پہ لاپھینکا۔ میرے من ٹوٹ کے پھرتے پھرتے اس اچانک حملے کے لیے تیار نہ تھی اس لیے منہ بھل تک نہ سکی اور آسانی سے گرتی پڑی۔ اس نے میرے بال نوچ کے مجھے گھسیٹنا چاہا۔ بی بی جان کے کہنے پر میں اٹھ آئی۔ میں تب تک اس نے میرے منہ پہ طمانچہ مار مار کے میرے سر پر جادو کیے تھے میری ناک کے خون بہ رہا تھا اور بال کھڑے ہوئے تھے۔ میری چیخ و پکار میرے اندر ہی کہیں دفن ہو رہی تھی۔ اس قدر ذلت مجھے فریاد کرنے بھی نہیں دے رہی تھی دگمہ اور سرحدی نے اسے پکڑ لیا لیکن اس نے زور سے لات مار کے میری پسلیوں پہ وار کیا۔ میں درد کی شدت سے دوہری ہو گئی۔

”کافرن . ہندنی ایک مرد سے تیری تسلی کہاں ہوتی ہوگی۔ چھوڑ میرے بھائی اور شوہر کا پیچھا چلی جا اپنے منموں پہازوں پر وہاں روانہ ہوگا چار چار مرد رکھنے کا آزادی سے عیش کرنا۔“

”کافرن ہوگی تو..... میں پھٹ پڑی۔“

”میں مومنہ ہوں..... مومنہ..... خان زریاب کی من چاہی بیوی..... مجھے چار مردوں کا طعنہ دینے والی ڈائن۔ خواہیک مرد کے قابل بن کے تو دکھا مجھے۔“ میں مزید چپ نہ رہ سکی میری لٹکار پہ اس نے خود کو چھڑایا۔ لپک کے آتش دان سے جلتی لکڑی نکالی۔ اس کا تیور بھانپ کے میں نے خود کو بچانے کی بہت کوشش کی لیکن میں خود کو مکمل طور پہ اس سے محفوظ نہ رکھ پائی۔ میرے چہرے پہ اس نے جلتی لکڑی رکھ دی۔“

اس وقت کی تمام تراذیت مومنہ کے لہجے میں اتر آئی۔ خوشنود آنکھوں میں درد لیے اس نڈھال چہرے کے اس سیاہ پڑے حصے کو دیکھنے لگا جہاں ایک بے رحم داغ پہ چند آنسو سرک رہے تھے۔

”میرے چہرے پہ اس نے جلتی لکڑی رکھ دی۔“

مقدس کے قدم اس ایک جیلے کے باندھ دیئے۔ وہ آئی سی یو کے ہوتی ہوئی اس کمرے تک آ رہی تھی۔ کمرے میں خوشنود کو باکے وہ لٹکی۔ اس کا سوچ ہی رہی تھی کہ اس کی موجودگی میں اندر چلی جائی یا چپکے سے واپس لوٹ جائے کہ اس کی آواز سے اس کا دھیان کھینچ لیا۔ وہ درد میں ڈوبی اس آواز میں گریہ کی ہو کے دروازے کے ہینڈل پہ ہاتھ رکھے وہیں کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ سنسان کوریڈور میں کوئی ذی روح نہ تھا۔ ہاسپٹل کے پرسکون ماحول میں دروازے کے اس پار کھڑی مقدس تک مومنہ کی گفتگو بخوبی پہنچ رہی تھی۔

”میرے چہرے پہ اس نے جلتی لکڑی رکھ دی۔“

مقدس کے رخسار دہکنے لگے۔ اس نے شدت منبٹ سے لب چل ڈالے۔ مومنہ نے گفتگو کا سلسلہ پھر شروع کیا۔

”وہ رات بڑی ظالم تھی۔ ساری شام میں نیم بے ہوشی کے عالم میں تھی۔ ایک کونے میں پڑی رہی تھی۔ جب ہوش آیا تو ایسا محسوس ہوا جیسے میرے بال کوئی تیلیں رہا ہے۔ میں نے سوچی ہوئی آنکھیں بمشکل کھولیں۔ سرحدی ہاتھ میں مرہم کی پیالی لیے کھڑی تھی۔ برسی آنکھوں کے ساتھ اس نے ہی شاید میرے جٹے ہوئے رخسار کو صاف کرنا چاہا تھا اور درد کی تیز لہر مجھے گھنٹوں کی بے ہوشی سے کھینچ لائی تھی۔ میں نے اس کا ہاتھ پرے کیا۔ مجھے اس کے اور دیگر ملازماؤں کے سامنے ہونے والی تذلیل یاد آ گئی۔ اب ان ہمدردیوں سے اس کا ازلہ نہیں ہو سکتا تھا میں نے گرتے پڑتے اپنی چادر اٹھائی، ڈولتے قدموں سے کمرے سے نکلی۔ سرحدی نے مجھے سہارا دینا چاہا لیکن میں نے اسے جھٹک دیا اس وقت مجھے سب سے نفرت محسوس ہو رہی تھی۔“

رات گہری ہو چکی تھی، مقدس بستر پر لیٹی کٹکاریاں بھر رہی تھی۔ سرحدی کی گیارہ سالہ پوتی اسے کھلا رہی تھی۔ مجھ پہ نظر پڑتے ہی وہ سرا سیمہ ہو گئی۔ جھنجھنا اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور وہ اٹنے کے قدموں کمرے سے نکل گئی، مقدس اس کو نظروں سے اوجھل پا کے رونے لگی۔ میرے کانوں تک اس کے رونے چلانے کی آواز بہت دور سے کہیں آ رہی تھی، میں نے خالی خالی نظروں سے اسے بستر پہ ہاتھ پیر شیخ کے روتے دیکھا لیکن میرے اندر کوئی تحریک پیدا نہ ہوئی میرا پورا وجود برف ہو رہا تھا صرف آدھا چہرہ جیسے شعلوں کی زد میں تھا۔ میں اس کے برابر لیٹ گئی۔ سرحدی نے آہ بھر کے مجھے دیکھا اور مقدس کو دودھ کی بوتل اور کھلونے سمیت اٹھا کے باہر لے گئی۔ جاتے جاتے وہ میرے سر پر ہاتھوں سے مرہم رکھ گئی۔ کئی گھنٹے ایسے پڑے رہنے کے بعد میں اٹھی اور آئینے میں خود کو دیکھنا چاہا۔ پیری چی نکل گئی۔ میرے گال سے چربی باہر نکلی ہوئی تھی۔ آنکھ تک جلد جھلس چکی تھی۔ روروؤ کے میرا گلا بیٹھ گیا۔ دن چڑھے تک میں بھوکی پیاسی، بخار میں جلتی، درد سے تڑپتی اکیلی پڑی رہی۔ پھر میں نے ایک فیملہ کیا۔

زریاب کے آنے میں ابھی کئی دن تھے۔ اتنے دن تک میں یوں بے یارو مددگار نہیں رہ سکتی تھی میں جانتی تھی اس سنگناخ حویلی میں کوئی ایسا نہیں جسے میں اپنا کہہ سکوں، میری میری تکلیف بانٹنے نہیں آئے گا۔ کوئی مجھے سنبھالنے نہیں آئے گا، اس طرز تو میں ختم ہو گئی تھی جب کہ مجھے زندہ رہنا تھا مقدس کے لیے زریاب کے لیے، مجھے خود اپنے لیے سنبھالنے کے لیے۔ زریاب نے مجھے اکیلا جان کے میرے ساتھ یہ ستم ڈھایا۔ بی بی جان مجھے سنبھالنے کے لیے یہاں میرے چھوڑ گئیں، لیکن میں ان سب کو بتا دوں گی کہ میں لاوارث نہیں۔ بے یارو مددگار نہیں۔

مجھے فیروز لالہ یاد آئے اور ان کا عہد بھی میرے اندر ایک توانائی سی بھر گئی۔ میں نے اپنے زخم کو مرہم سے ڈھانپا۔ گرم دودھ منگوا کے پیا۔ ذرا ہمت آ جانے پہ سرحدی کی مدد سے مردان خانے جا کے فیروز لالہ کو نون کیا۔ میری سسکیاں انہیں احساس دلا گئیں کہ بات غیر معمولی ہے اس لیے تین گھنٹے میں ہی وہ میرے پاس موجود تھے۔ میری حالت دیکھ کر وہ ششدر رہ گئے۔

”مومنہ..... تم..... یہ سب کیسے ہوا؟“ وہ گمان بھی نہ کر پائے کہ یہ سب کس نے کیا ہوگا اور جب میں نے خود پہ پڑنے والی افتاد کا ذکر کیا تو وہ چند لمحے بے یقینی سے بیٹھے رہے پھر ان کی آنکھیں غیرت کے مارے لہورنگ ہو گئیں۔

آنے میں چند ہی دن رہ گئے ہیں۔ بلکہ میں اسے جلد از جلد بلوانے کی کوشش کروں گا۔ بہتر ہوگا کہ تم یہیں رک کے اس کا انتظار کرو۔“ میں تذبذب کا شکار تھی میری ہچکچاہٹ دیکھ کے بی بی جان نے ہنتر ابدلا۔

”شوہر کی غیر موجودگی میں قدم باہر دھرنے والی عورتیں با اعتماد نہیں ہوتیں۔ پھر بھی اگر جانا چاہو تو یاد رکھو بچی میں تمہیں نہیں لے جانے دوں گی۔ تم پہ تمہارے اس نام نہاد بھائی کا اختیار چل سکتا ہوگا۔ خنک خاندان کی بیٹی یہ وہ کوئی حق نہیں جما سکتا۔“ بی بی جان کا خیال ہوگا بچی کے بغیر میں جانے کا فیصلہ نہیں کر پاؤں گی، اور شاید ایسا ہی کرتی میں، لیکن فیروز لالہ نے اصرار کیا۔

اپنی بچائی ثابت کرنے کے لیے زندہ رہنا ہے، اور نہ سچ کو دبانے کے لیے یہ لوگ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ اس تہمت پر اب تک محل سے بیٹھے باچا جان بھی بھڑک اٹھے۔

”فیروز خان تم بے ادبی کے مرتکب ہو رہے ہو،“ میں اور بھی خوفزدہ ہو گئی۔

”ہمت کرو مومنہ، بچی ان کا اپنا خون ہے اسے یہاں کوئی خطرہ نہیں اگر یہ رکھنا چاہتے ہیں تو رکھنے دو چند دن کی بات ہے۔ زریاب سے رابطہ کر کے میں اسے فوراً واپس بلاواتی ہوں۔ میرے گھر یہ بی ساری بات ہوگی۔ تم تیاری کرو۔ یہاں رہو گی تو یا تو پاگل ہو جاؤ گے یا مار دی جاؤ گی۔“ میں نے اک نظر باچا جان اور بی بی جان کے جلائی چہرے دیکھے۔ میرے خیال سے ٹیسس اٹھنے لگیں۔ میں نے فیروز لالہ کو دیکھ کے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اپنے چہرے اٹھائے اور مقدس کو پیار کر کے باچا جان کے پاس رخصت کرنے کے لیے دونوں نے پھیر لیا۔

”تمہیں عزت کی بڑی خواہش ہے اور خود تم اس گھر کی عزت روند کے جا رہی ہو۔ اس شخص کے ساتھ جو تمہارے ساس سردونوں کی بے عزتی کر گیا تمہارے سامنے اور یاد رکھو تم اس گھر سے بغیر کسی کی رضا مندی کے جا رہی ہو۔ نتائج کی ذمہ دار بھی تم ہی ہو گی۔“

باچا جان نے سرد لہجے میں کہا اور میں..... میں چلی گئی۔

مومنہ خاموش ہو گئی تھی لیکن مقدس کو ایک ننھی سی بچی کے رونے کی آوازیں اب تک آ رہی تھیں۔

☆☆☆

”بی بی جان میں شکستہ ہو چکا ہوں کچھ تاب لانے کی مجھ میں مزید ہمت نہیں نہ ہی دل اب اور کوئی گھاؤ سبہ سکتا ہے۔ مجھے مزید مت الجھائیں۔ میرا دماغ پھٹ جائے گا۔“

”مجھے طمانچہ، لاتیں، گھونٹے مارے، گالیاں بدو عنائیں دیں۔ گندے اثرات لگائے، جلتی لکڑی میرے چہرے پہ رکھ دی۔ میں سچ کہہ رہی ہوں باچا جان میں نے کچھ نہیں کیا۔ مجھے اللہ رسول کی قسم، میرا کوئی قصور نہیں۔“

”تو کیا اور تیری قسم کیا۔ جب اللہ رسول پہ تیرا ایمان ہی نہیں تو قسم کیوں اٹھاتی ہے۔ تو تو قسم اٹھا کسی بت کی، کسی سانپ کی، سورج کی، جن چیزوں کو پوجتے ہو تم کافر لوگ۔“ بی بی جان کے اس طعنے پہ فیروز لالہ بچر گیا۔

”باچا جان، یہ آخری حد ہے، آپ خود اندازہ لگالیں اس گھر میں اس کے ساتھ کیسا سلوک ہوتا ہوگا۔ یہاں نہ اس کے کردار کا احترام کیا جاتا ہے نہ ایمان کا۔ جب میں نے اسے رخصت کیا تھا تو آپ سے واضح الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ آپ کے گھر میں اس کا پرانا حوالہ کوئی یاد نہیں رکھے گا۔ یہ وردگ حویلی سے رخصت ہو رہی ہے، وردگ خاندان سے خنک خاندان تک جاری ہے میں نے اپنا نام اس کے نام لگانے سے انکار کیا ہے آپ کے حوالے کیا تھا۔ بی بی جان نے اسے نہیں مجھے گالی دی ہے بلکہ خاندان لودھی ہے۔“

”خاندان خون سے ہوتا ہے، نسب سے ہوتا ہے فیروز تم بھی پٹھان ہو، ہم بھی پٹھان ہیں۔ یہ بات تو جانتے ہو گے نسلیں اپنا خون پہنچتی ہیں تو نام کے آگے کوئی حوالہ لگتا ہے۔ میں ان رشتوں کو نہیں مانتی۔ زبانی کلامی کہہ دینے سے کوئی بہن ہو جاتی ہے نہ بھائی بن جاتا ہے۔“

”بی بی جان میں آپ سے بحث نہیں کرنا چاہتا۔ باچا جان سے اجازت لینے آیا ہوں کہ مومنہ کو اپنے ساتھ لے جا رہا ہوں۔ اب زریاب آئے گا تو ہی کوئی فیصلہ ہوگا۔“

ابھی باچا جان کچھ کہنے نہ پائے تھے کہ بی بی جان کبہ انہیں۔

”یہ کہیں نہیں جائے گی۔“

”کیوں نہیں جائے گی۔ اس کی حالت دیکھیں۔ یہ کمزور ہے، بیمار ہے، زخمی ہے۔ اسے کس کے سہارے چھوڑ کے جاؤں میں۔ آخر آپ کی بیٹی بھی تو کافی عرصے سے یہاں رہ رہی ہے۔“

یہ اس کے باپ کا گھر ہے۔“

”مومنہ بھی اپنے بھائی کے گھر جا رہی ہے۔“

”وہ اپنے شوہر کے ساتھ، اس کی اجازت سے یہاں آئی ہے۔“

”میں بھی باچا جان سے اجازت ہی طلب کر رہا ہوں۔“

”مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن میں مومنہ سے یہ ضرور کہنا چاہوں گا کہ زریاب کے

جو کہتا ہے صاف صاف کہیں۔“

زریاب نے بے بسی کی آخری انتہا پہ پہنچ کے بی بی جان کے گھسنے تمام کے فریاد کی جو باچا جان کی ہلکتی نگاہوں سے ہار مان کے عرصے سے سینے میں دبا رکھولنے پہ آمادہ تھیں۔ انہوں نے زریاب کے ہاتھ اپنے پہلو سے اٹھائے، لبوں سے لگا کے کہنے لگیں۔

”زریاب مجھے معاف کر دینا۔ میں خان جی کے سامنے، اپنے بیٹوں کے سامنے تم سے معافی مانگتی ہوں اور یہ اعتراف کرتی ہوں کہ ممتا کی کسوٹی پہ میں گھری نہ اتر سکی۔ ایک کمزور لہجے نے مجھے سکے اور سو تیلے رشتوں میں ڈنڈی مارنے پہ اکسا دیا۔ میری ذرا سی لغزش نے کئی زندگیاں برباد کر دیں۔ مجھے معاف کر دو میں تمہاری گناہ گار ہوں۔“

”بی بی جان! وہ بے یقینی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ جھنجھلاہٹ اس کے چہرے پہ ہو رہی تھی۔

”میں کچھ سمجھ نہیں پا رہا۔ خدارا مجھے اور یہ بات سے بچاؤ۔ کیا کہنا چاہتا ہے آپ؟“

کن کمزور لہجوں کی بات کر رہی ہیں؟“

”یہ لمحے میری بیٹی زریاب کی زندگی سے میری زندگی تک نقب لگانے کے چلے آئے تھے۔ تم جانتے ہی ہو تمہاری بہن کی وجہ سے میں کتنی پریشان رہتی تھی۔ تیس سال سے اوپر ہونے کے بعد بھی اس کی شادی نہ ہو پارہی تھی۔ شکل و صورت بھی اس کی واجبی تھی اور تعلیم بھی برائے نام تھی۔ اگرچہ خٹک خاندان کی بیٹی کے لیے اس کے خاندان کا نام نہیں ہوتا ہے، صورت وغیرہ تو بعد کی باتیں ہیں لیکن اس کی قسمت کہ خاندان میں اس کے جوڑ کا کوئی مرد نہ تھا۔ اور خاندان سے باہر لڑکیاں بیانیے کا ہمارا رواج نہیں تھا۔ ایسے میں بڑھتی

عمر کے ساتھ ساتھ تنہائی، محرومی اور مایوسی نے اسے کمرہ چھوڑ دیا۔ خان جی نے مجھ سے اپنی بہن پہ دباؤ ڈالنے کے لیے کہا جس کا بیٹا رحیم گل ہماری زر سے پندرہ سال چھوٹا تھا۔ مجھے کچھ تامل تھا لیکن خان جی کے بہیم اصرار پہ میں بہن سے فریاد کر بیٹھی۔ میری محبت میں اس نے کسی طرح بیٹے کو منا ہی لیا یوں بھی سترہ اٹھارہ سالہ لڑکا ابھی اتنا خود سر کہاں ہوا تھا کہ احتجاج کر پاتا ماں باپ کے سامنے۔ لیکن اپنی ساری تنگی اس نے بیوی پہ نکالنا شروع کر دی۔

زریاب نے کوئی کم عمر لڑکا تو نہیں تھی کہ شوہر سے دب جاتی پھر شوہر بھی وہ جسے چند سال پہلے تک وہ گود میں کھلاتی رہی ہو۔ اس نے بھی رحیم گل سے الجھنا شروع کر دیا۔ اگرچہ یہ ہماری برادری کا پہلا واقعہ نہیں تھا اس سے پہلے بھی کئی بے جوڑ رشتے ہو چکے تھے اور برے

بھلے بیٹے بھی چکے تھے لیکن اب وقت بدل رہا تھا۔ تعلیم اور شعور نے ذہن تبدیل کر دیا تھا۔ نہ تو رحیم گل کرخت مزاج پکی عمر کی بیوی کو دگھن تسلیم کر سکا نہ ہی زریاب کے خوابوں کو تعبیر ملی اکھڑے اکھڑے رہنے والے کم عمر شوہر سے، رحیم گل کے ساتھ نے اس کی رہی سہی خود اعتمادی بھی چھین لی۔ وہ احساس کمتری کا شکار ہو گئی اور ستم یہ کہ رحیم گل کا رویہ اس کے احساس کمتری کو دیوانگی میں بدلنے میں مددگار ثابت ہونے لگا۔ وہ اس کے سنگھار پہ تنقید کرتا، اس کی عمر اور شکل پہ بے رحمانہ تبصرے کرتا، اپنی مظلومیت کا رونا روتا اور اس کی کم علمی اور بدزبانی کو کوستا۔ زریاب نے ہمیشہ یہ سب مجھ سے بیان کرتے ہوئے بلک پڑتی۔

”بی بی جان! باچا جان نے کیوں زبردستی مجھے اس کے سر منڈھا، میں ان جاہلی ستمی کی طرح اس کے اوپر مسلط نہیں رہنا چاہتی۔ لوگ اسے ترحم آمیز نظروں سے دیکھتے ہیں اور مجھے ایسے جیسے میں کوئی جاوگرنی ہوں جس نے ایک شہزادے کو اپنی قید میں کر رکھا ہے۔ بی بی جان! مجھے ضرور سنی دینا تھا تو خٹک باؤس کے ہی کسی کو نے میں رکھ دیتے۔ غیروں کے حوالے کرنے کی کیا ضرورت تھی اور وہ بھی اتنا گر کے، خالہ جی اب اٹھتے بیٹھتے جاتی ہیں کہ بہن کے بہکاوے میں آ کے بیٹا ناقدروں میں رول دیا۔ ان کی بیٹیاں ماں کو

ماتلا ہیں کہ ہمدردی اور ترس کے نام پہ اکلوتے بیٹے کے لیے اماں اٹھالائی ہو۔“

”صبر کر، زرے صبر۔“ میں اور کیا کہتی۔ ”وقت کے ساتھ ساتھ سب صحیح ہو جائے گا۔“

”بی بی جان! آنے والا وقت اور بھی تباہی لانے والا ہے۔ ابھی رحیم گل کم عمر ہے، پڑھ رہا ہے، پڑھ رہا ہے وقت کے ساتھ ملنے والے اختیارات اسے خود مختار بنادیں گے اس کی بچھوری کے ساتھ مجھ سے نباہ رہا ہے۔ کل کو شاید۔“

”اپنا بول منہ سے نکال کر۔ تو ماں بننے والی ہے اچھی باتیں سو جا کر۔ آنے والی اولاد میری قسمت کھول دے گی۔“ لیکن میں نہیں جانتی تھی کہ اولاد اس کی قسمت میں اور اندھیرے لگھ لگھ لائے گی، شاد و جن دنوں پیدا ہونے والی تھی، زرے یہیں تھی۔

”تم بھی تم مو منہ کو بیاہ لائے۔ یہ واقعہ اس کی ازدواجی زندگی میں نئی نئی گھول گیا۔ رحیم گل تمہیں اتنی آزادی کے ساتھ من چاہی بیوی ملنے پر رشک و حسد کا شکار ہو گیا۔ اس کا نشانہ پجاری زریاب نہ ہی ہوتی۔

”من مانیاں کرنا تم لوگوں کا پیدائشی حق ہے، بے ناں؟ بیٹی کو خود سے آدمی عمر کا خوب صورت لڑکا چاہیے تھا، ماں بیک مانگ کے لے آئی۔ بیٹے کو جنگلی پھول پسند آیا۔ باپ میلوں چل کے توڑ لایا اور کچھ لوگ مجھ جیسے بد قسمت ہوتے ہیں۔ جن کی ڈور سدا

دوسروں کے ہاتھ میں رہتی ہے۔“

”لالہ کی شادی کا ذکر کیوں بار بار کرتے ہیں آپ؟ اگر انہوں نے پسند کی شادی کی

ہے تو اس میں میرا کیا قصور؟“

”اور میرا قصور کیا تھا جسے اطاعت اور فرماں برداری کے سبق سکھائے گئے۔ جب

میری ماں نے کہا کہ رحیم گل کو اس رشتے پہ اعتراض ہے تو تمہارے والدین نے میرے

گھر آ کے میرے ماں باپ کو پٹی پڑھائی کہ بیٹے کی مرضی کیا چیز ہے۔ اصل بات خاندانی

ناموس کی ہے۔ خاندان کے بیٹے ہی خاندان کی عزت نہیں ڈھانپیں گے تو کیا باہر سے

لوگ آئیں گے مجھے ہر طرح سے مجبور کر کے قربانی کا بکر بنا دیا گیا۔ زریاب کو کچھ بھی

کس نے دی؟ تمہارے باپ نے ہی۔ اب کیوں برادری کی کوئی ذمہ داری نہ لیتی؟“

نہ آئی؟ اس کے یہ طعنے روز کا معمول بن گئے۔ زریاب نے انہیں دونوں سے تھی۔ اس حالت

میں عورت ویسے ہی زور و زنج اور حساس ہوتی ہے۔ رحیم گل نے اسے جلا جلا کے اور بھی

ادھ موا کر دیا تھا۔ وہ سنگ باری کر کے چلا گیا تو وہ نہ چاہتے ہوئے بھی مومنہ پہ توجہ

کرنے پہ مجبور ہو جاتی۔ تمہاری محبت نے اس کی سب انگوں والا روپ چڑھا لیا تھا۔ اس

کے جھل مل کرتے چہرے اور قل قل کرتی ہنسی اور بے رحمی کے کھیلوں کے نتیجے میں وہ

دونوں کو دیکھ کے کھسنے لگتی۔ تمہارے قبضے اپنے اپنے گلوں پہ ہنستے معلوم ہوتے۔ اپنی

ناخوشگوار اور غیر متوازن زندگی کا قتل اسے رہنے لگا۔

اسی ہی عجیب و غریب کیفیت میں اس مینے شاور کو جنم دیا۔ کنڈری تحت کی

بجہ سے اس کا چڑچڑاپن عروج پہ پہنچ گیا۔ کسی کی ذرا سی بات بھی اسے مشتعل کر دیتی۔

رحیم گل ہر نئے آتا اس کی حالت میں مزید ابتری پیدا کر کے چلا جاتا اور تمہاری سب سے

اظہار پنچی اور ملازماؤں پہ نکالا کرتی۔ رفتہ رفتہ مومنہ بھی اس کا نشانہ بننے لگی، پھر مومنہ کے

بعد جب تم کاروباری دورے پہ گئے تو ایک بار پھر رحیم گل آیا۔ اسے اس کی ماں نے زر

سانگہ کولانے کے لیے بھیجا تھا۔ بیوی کی حالت دیکھ کے وہ اور چڑ گیا حالانکہ یہ حالت

سراسر اس کی دین تھی۔ زچگی کے بعد انسردگی اور زندگی سے بیزاری نے اسے سخت کی

جانب لوٹنے ہی نہ دیا تھا۔ اندر ہی اندر کڑھ کڑھ کے اس کا سارا خون جل گیا تھا۔ چہرے

پہ تھانیاں پڑ چکی تھیں، آنکھیں زرد اور ہاتھ پیرے جان۔

”اس لاش کو لانے بھیجا ہے ماں نے ساری عورتیں ہی اولاد پیدا کرتی ہیں۔ تم نے

یہ نور آ جاتا ہے، تمہارے چہرے کی تو رہی سہی رونق بھی غائب ہو گئی ہے۔ اپنی بھانج کو

دیکھو۔ گلاب کھل رہے ہیں چہرے پہ۔“

”تو جاؤ سو گئے لو، وہ تو جنگلی پھول ہے ناں بقول تمہارے۔ جنگلی سو غاتیں سب کے

لیے ہوتی ہیں تم بھی مزالے لو۔“

”شٹ اپ بد تمیز عورت کچھ تو لحاظ کرو تمہارے چھوٹے بھائی کی بیوی ہے وہ۔“

”تم کیوں نہیں رشتوں کا لحاظ کرتے جب اس کے حسن کے قصیدے پڑھتے ہو۔“

”کون سا قصیدہ پڑھا ہے میں نے! تم تو مفت میں بدنام کرنے والی عورت ہو،

تمہارے سائے سے بھی دور رہنا چاہیے۔ منجوس بڑھیا۔“ وہ زہر تھوک کے چلا گیا اور

کھلیے ساری رات ان کڑوے الفاظ کی مار سستی رہی لیکن کمزور اعصاب کی عورت اتنا سب

سبب نہ کھلی۔ اس کے اندر لاوا پک کے تیار ہو گیا تو وہ کمرے سے نکلی اسے پتا چلا کہ

مہمان خانے میں رحیم گل کے ساتھ مومنہ بھی ہو جو وہ تو جیسے آتش فشاں پھٹ گیا۔ اتنے

دونوں سے اس کے اندر جینج بھڑا اس ایک دم ہی نکل گئی اس نے مومنہ اور اپنے شوہر کے

حوالے سے کچھ ایسی باتیں کہیں کہ وہ بھی غصے سے باہر نکل گیا اور مومنہ بھی ضبط نہ کر سکی

اس نے مومنہ سے جواب سنا اور اس کے سامنے بالکل ہی دیوانی ہو گئی اس نے..... اس نے تمہاری

بیوی پر ہاتھ اٹھایا۔ میں نے، کمرہ نے، سرحدی نے سب نے اسے قابو کرنے کی بہت

کوشش کی لیکن وہ ہوش و حواس میں نہیں تھی۔ جیسے کوئی جن اس پہ قابض ہو گیا تھا اتنی

طاقت اس کے اندر بھر گئی تھی، عجیب سی وحشت اس کے چہرے سے نپک رہی تھی، میں

خونزدہ ہو گئی وہ بااں اور کھڑکی اور مومنہ پہ بل پڑتی، ہاتھوں، پیروں کے بے دریغ

استعمال کرتے ہوئے اور پھر..... میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے آتش دان سے لکڑی نکالی

اور مومنہ کا..... مومنہ کا چہرہ داغ دیا۔“

زریاب دم بخود بیٹھا رہ گیا۔ دراب اور افراسیاب کے چہروں پہ بھی استعجاب تھا

جب کہ بی بی جان نے ایک بار بھی نہ نظر اٹھائی نہ چہرہ۔ ان کے جھکے چہرے سے آنسو

نپک نپک کے گود میں رکھے ہاتھوں پہ پڑنے لگے۔

زریاب کے تصور میں مومنہ کا بے داغ ہنستا چہرے آیا اور شعلے... اس نے

کرب سے آنکھیں موند لیں۔

”میں مانتی ہوں مجھے صورت حال کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے مومنہ کی

دلجوئی کرنا چاہیے تھی اگر میں اس وقت اسے سنبھال لیتی تو شاید حالات اتنے خراب نہ

ہوتے لیکن زرسا نگہ کی کیفیت نے میرے ہاتھ پاؤں پھیلا دیے۔ وہ بے ہوش ہو گئی تھی اور ڈاکٹر کے مطابق اگر یہ کچھ دیر اور ہوش میں رہتی تو اس کی دماغ کی شریان کا پھٹنا یقینی تھا۔ دوسری طرف عم و غصے اور بے بسی کا شکار مومنہ نے میری لاعلمی میں فیروز کو مدد کے لیے طلب کر لیا۔ خان جی اب تک سارے قصے سے انجان تھے۔ لیکن اب ان کے ساتھ ساتھ سارے گھر کو علم ہونے والا تھا کہ زرسا نگہ سے کیا حرکت سرزد ہوئی ہے۔ جب اسے ہوش آنے پہ علم ہوا کہ فیروز مومنہ کے ساتھ خان جی کے کمرے میں ہے اور زریاب کو بلوانے کا فیصلہ ہو رہا ہے تو وہ سرا سیمہ ہو گئی۔ میرے پیر پکڑ کے منت کرنے لگی۔

”بی بی جان زریاب کو کچھ پتا نہ چلے۔ وہ پاگل ہو جائے گا اپنی بیوی کا چہرہ دکھنے کے وہ مجھے کبھی معاف نہیں کرے گا۔“

”اسے تو پتا چل ہی جائے گا کمرے میں مومنہ کا چہرہ خور ہو جائے گا۔ یہ تو کون سے کیا کیا بد نصیب۔“ میں نہ چاہتے ہوئے ابھی اسے کون سے ایجنڈے کی باتیں کر رہی تھی۔

”رجیم کل پہلے ہی مجھے بتانا نہیں چاہیے اب مجھے یہ پتا نہیں کہ الزام لگانے کے مجھے رسوا کر دے گا بھائی کی نظروں سے بھی گریز میں کہاں جاؤں گی۔ میں تو ہر طرف سے بے وقعت ہو جاؤں گی بی بی جان۔“ وہ بلک بلک کے رو رہی تھی۔

”یہ تو پہلے سوچنا تھا۔ اب کیا ہو سکتا ہے اسے۔“ میں نے اسے ہاتھ سے نکل گئی تھی۔

آگ انھا کے اس پہ لگی تھی۔ زریاب کی چیخوں کا منہ جلادیا تو نے..... وہ تو اک پل یہاں نہ رہے گا اب۔“

”کچھ کرو بی بی جان، کچھ کرو زریاب کے اسے پہلے پہلے کچھ ایسا کہو کہ میں بچ جاؤں، دنیا مجھے جینے نہیں دے گی۔ میرا کوئی ٹھکانہ نہ رہے گا۔“ اسے پانچ کپڑوں کے ٹھکرائیں گے تو بھائی بھی نفرت کریں گے۔ مجھے بچاؤ..... زریاب کو تو بچھڑنے دو۔ مومنہ کے پاؤں پکڑ کے منت کر لوں گی میں، اسے کسی طرف جانے سے روک دو میں اس سے معافی کی بھیک مانگوں گی، ہوں گی میرا نام وہ مت لے۔“

”اور اگر وہ نہ مانی تو؟“

”تو..... تو پھر میں اسے مل دوں گی۔ جب میں اس کا چہرہ جلا سکتی ہوں تو پورے کا پورا بھی بھسم کر سکتی ہوں۔ وہ نہ رہے گی تو کون بتائے گا زریاب کو، کیسے پتا چلے گا رجیم گل کو۔“ اس کی آنکھوں کی پتلیاں پھر چڑھ گئیں اور ہاتھ پیر مڑنے لگے۔ گردن کو خفیف سے جھٹکے لگنے شروع ہو گئے۔

میں ہار گئی..... ممتا کے ہاتھوں..... ساری عمر پڑا سلامت رکھا..... ایک لمحہ ایسا نہ آیا اتنے سالوں میں کہ تم میں اور افراسیاب میں دراب اور زرسا نگہ کے مقابلے فرق برتا ہو لیکن اس وقت..... لیکن نہیں..... شاید زرے کے بجائے میری کوئی اور بھی اولاد ہوتی تو میں یہی کرتی..... چاہے تم ہوتے چاہے دراب..... جب کسی ایک اولاد کی جان پہ بن آئے تو ماں سب کر گزرتی ہے میں نے سوچا تمہاری شاہدی شدہ زندگی میری بیٹی کی جان سے قیمتی تو نہیں ہوگی۔ بیٹا سلامت تو ہوئیں اور مل جائیں گی اپنی لاڈلی کہاں سے لاؤں گی۔ میں کیا جانتی تھی میں تو سب کچھ گنوانے جا رہی تھی سب کچھ۔

میری ہر کوشش کے باوجود فیروز مومنہ کو لے گیا خان جی مومنہ کے ساتھ ہونے والے سلوک سے ناخوش تھے لیکن فیروز کے اشتعال انگیز جملے انہیں بھی ناگوار گزرے میں نے ان سے پہلے سے فائدہ اٹھانے کی باتیں اور دغلا یا اور ایک منصوبہ تیار کر لیا۔ میں جانتی تھی فیروز کے بارے میں زریاب فوراً چلا آئے گا۔ اور پھر۔ مومنہ کی زبانی سب کچھ سن کر..... یہی تو میں نہیں چاہتی تھی۔ میں نے ان کے ساتھ ساتھ بیٹھے بیٹھے دیکھا کہ وہ ربا تھا میں نے زریاب کو خان جی کی بیماری کی اطلاع دے کر فوراً آنے کو کہا۔ میرا پیغام جب اسے ملا تب تک تو فیروز ابھی گھر بھی نہ پہنچا ہوگا۔ زریاب اطلاع ملتے ہی وہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔ فیروز سے ان کا رابطہ نہ ہوگا۔ تیسرے دن جب..... بی بی جان نے کہتے کہتے سراٹھایا، کمرے میں موجود تمام نفوس پہ ایک نظر ڈالی، پھر ان کی نگاہیں گم صدم بیٹھے لہ زریاب پہ جم گئیں۔

”تیسرے دن..... تم آئے تو میں حواس باختہ ہو گئی۔ خان جی کا غم کم ہو چکا تھا۔ وہ میری چال میں شریک ہونے سے انکاری تھے بلکہ انہوں نے مجھے سختی سے باز رہنے کا حکم دیا لیکن اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا میں نے اپنی عمر بھر کی دغاؤں اور خدشوں کے بدلے ان سے یہ گستاخی کا حق مانگ لیا انہیں اللہ اور رسول کے واسطے دیے، اولاد کی قسمیں دے کر مجبور کر دیا۔ وہ جب کر گئے اور میں نے تمہیں“

ان کی آواز لڑکھرائی تو زریاب نے ہاتھ کھڑا کر کے انہیں خاموش رہنے کی استدعا کی۔ وہ جانتا تھا آگے کیا ہوا۔ بو بھل قدموں کے ساتھ وہ دائیں طرف موجود بڑی سی کھڑکی کے پاس چلا گیا۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔

شفیق کی لالی حد تک خون کی لکیر کی طرح پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے کانوں میں بی بی جان کے سالوں پہلے کہے بے رحم الفاظ کی بازگشت سنائی دی۔

”میں نہ کہتی تھی زریاب، نسب کے بغیر اصول کچھ نہیں ہوتا۔ جنگل کے پھول جنگلوں میں ہی رہ پاتے ہیں۔ تمہاری وہ بیوی چار دن تمہارے بغیر نہ رہ سکی۔ تمہارے جاتے ہی وہ تمہارا دست فیروز جو خود کو اس کا بھائی بتاتا ہے، تو بہ تو بہ کیسے کیسے رشتوں کو پامال کرتے ہیں یہ بے ہدایتے لوگ، وہ روز ہی آجاتا تھا ملنے، اس سے پہلے مجھے اعتراض نہ ہوا پھر لوگ باتیں بنانے لگے آخر کون سا ساگا والا بھائی تھا۔ گھنٹوں کمرے میں بند رہتے تھے۔ میں نے صاف الفاظ میں ٹوکا تو وہ تو کھل کے ہی سامنے آگئی۔ بے شرمی سے اپنے اور اس کے تعلقات کو تسلیم کرتے ہوئے کہنے لگی میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتی، تمہیں اپنا بیٹا مبارک ہو جس نے مجھے یہاں قید کر کے رکھا ہوا ہے۔ میں فیروز کے ساتھ جا رہی ہوں۔ میری تمام تر خوشیاں اسی کے پاس ہیں نامراد بچی تک چھوڑ گئی۔“ وہ چیخ اٹھا تھا۔

”بس کریں بی بی جان، آپ سب جانتی ہیں آپ کیا کہہ رہی ہیں کس کے پاس کب رہی ہیں اور کس سے کہہ رہی ہیں۔“ اس وقت طیش کے مارے اس کا بس نہ چل رہا تھا کہ اپنا سر سامنے کی دیوار سے پھوڑ ڈالے، کیونکہ فیروز نے باپ سے والی اس کی معزز ترین بی بی جان تھیں جن سے بے ادبی کا وہ تصور بھی نہیں سکتا تھا لیکن اس قدر فضول باتیں۔

”پانی سر سے اونچا ہو چکا ہے زریاب تمہیں لیکن نہیں تو اپنے باپ سے پوچھو، میں تو ساس ہوں ناں اس کی اور تمہاری سوتیلی ماں۔ جھوٹ بھی کہہ سکتی ہوں، اس گھر کے ہر

فرد سے پوچھ لو۔ کس بے شرمی اور بے غیرتی کا مظاہرہ کر رہے ہو تمہارا دوست اور تمہاری بیوی۔ دیکھو خان جی کی حالت اور جا کے دیکھو زمر سائلہ کو۔ کیسے بے سدھ بڑی ہے۔ یہ تماشا بھی تو نبیائی تھا اس گھر کے درو دیوار کے لیے۔ میں تو کہتی ہوں بی بی زریاب یہ

کیوں ہوں یہ سب دیکھنے کے بعد شاید تمہاری آنکھوں میں بے انتہاری کے رنگ دکھانا باقی تھے یا شاید تم سے جھوٹا ہونے کا الزام سننا باقی تھا۔“

”بے حیا میرے سامنے ہی کتنا گندبک گئی۔ کہنے لگی زریاب جیسے نمس مرد کے ساتھ کوئی عورت چار دن بھی خوش رہ لے تو بڑی بات ہے۔ ہر وقت رنگوں میں گم رہنے والا دیوانہ۔ میں تو فیروز جیسے مرد کے پیچھے مرنی ہوں جسے مرد کہنے میں بھی مزا آتا ہے۔“

بی بی جان کا یہ جملہ زریاب کو بھڑکا دینے کے لیے کافی تھا۔

”موم..... نہ.....“ وہ چیخا۔

”میں چھوڑ دوں گا نہیں اس ذلیل عورت کو نہ ہی اس بے غیرت شخص کو۔ میری آنکھوں میں دھول جھونکی دونوں نے۔“ غیرت دغھے سے وہ کپکپانے لگا۔

”دفع کر دو مردوں کو۔ تین حرف بھیج اس کا فرن پہ، جانے دے جہاں مرضی خوار ہوتی پھرے۔ اس کی منزل یہ گھر تھا ہی نہیں شکر سے تمہاری بچی محفوظ رہتی ہے۔“

”ایسے کیسے دفع کر دوں۔۔۔۔۔ وہ میری مردانگی کو گالی دے گئی ہے، فیروز میری دوستی کا خون کر گیا ہے۔ میں بے غیرتوں کی طرح بیٹھ جاؤں..... نہیں بی بی جان..... میں ان دونوں کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ وہ دیوار سے لگی رائفل اٹھا کے باہر لپکا۔

”زریاب..... رک جاؤ۔“ وہ پکاریں باچا جان اٹھتے اٹھتے گر پڑے۔ اچانک ہی فالج نے ان پہ حملہ کر دیا۔ حشر بی بی نے ایک نظر شوہر کے اٹھتے ہوئے وجود پہ ڈالی دوسری نظر طوفان کی طرح باہر نکلتے کڑیل بیٹے پہ ڈالی۔ پٹی بار نہیں اپنے فیصلے کی سنگینی کا احساس

ہوا.....

تارنگاں یار دیاں
ہر ویلے آتا میں سانس بیٹھی کاگ اڈواں

وہ دو دن قیامت کے دن تھے۔ کہتے ہیں ناں روز حشر کی کو کسی کا ہوش نہیں ہوگا۔ وہی حال میرا تھا ان دنوں، فرق صرف یہ تھا کہ مجھے اپنا ہوش نہ تھا..... میری سانسیں ابھرتی تھیں، ڈوبتی تھیں اور ہر سانس کے ساتھ تسبیح کے دانے کی طرح ایک نام سینے میں گر جاتا تھا۔

زریاب.....

انگلوں، دیوانوں کی طرح حویلی کے دروازے تک دن میں کئی چکر لگایا کرتی۔

میں سے لڑ پڑاں آپ بچھاں کہ میں قاصد و بچھاں
میرا گلی گیا حال نماں

فیروز لالہ سے جرح کر کر کے میں نے زچ کر ڈالا۔

مجھے یقین نہ آتا کہ وہ زریاب سے رابطہ کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ مجھے لگتا جیسے

مجھ سے کچھ چھپایا جا رہا ہے۔

”کہیں زریاب نے آنے سے انکار تو نہیں کر دیا، کہیں میرا بغیر اجازت گھر سے نکلنا

اسے ناراض تو نہیں کر گیا، کہیں بی بی جان نے اسے بھی تو یہ کہہ کر نہیں درخالیایا کہ زمر سائلہ سے جھگڑا بڑھانے میں ساری غلطی میری ہے۔“

میری ہر سوچ کی تان انہی خدشوں پہ آکے ٹوٹ جاتی۔ اس کی ناراضگی کا لاکا سا

اندیشہ بھی مجھے بے جان کرنے کے لیے کافی تھا۔ میں آس ہار کے بے دم ہونے لگتی تو کانوں کے پاس کسی کی سرگوشی میرا پھر سے حوصلہ بڑھا دیتی۔

غلام فرید میں تاں دوزخ سڑساں
جے میں کھ ماہی دلوں موڑاں

میں ہر خدشے جھٹک دیتی۔

”نہیں نہیں میرا زریاب مجھ سے منہ نہیں موڑ سکتا، وہ مجھ سے خفا نہیں ہو سکتا..... اس میں اتنا حوصلہ ہی کہاں ہے..... پھر..... پھر.....؟ پھر وہ آیا کیوں نہیں اب تک؟ میرے ساتھ اتنا کچھ ہو گیا وہ کیسے انجان ہے؟ کیا اسے کسی سے اطلاع ملنے کی ضرورت ہے؟ وہ تو کہتا ہے..... مومنہ تجھے پیاس لگتی ہے تو مجھے پتا چل جاتا ہے..... میں گہری نیند میں محسوس

کر لیتا ہوں تو نے کب کروٹ بدلی..... پھر اسے پتا کیسے نہ چلا کہ وہ چہرہ دیکھنے کے اس کی صبح نکھرتی ہے..... اب داغدار ہو چکا ہے..... سگ رہا ہے اس کے پیاز بھرے مرام کے بے ترس رہا ہے..... زریاب..... زریاب..... کہاں ہے.....“

ہاں میں سچ سچ دیوانی ہو گئی تھی۔

کھلی کر کے چھوڑ دو اے

تے بیٹھی ککھ گھیاں رہیں

مجھے نہ بھوک لگتی..... نہ پیاس محسوس ہوتی۔ اپنی آس میں پھنس گئی تھی لہجہ

کے پورے وجود پہ چھا جاتی مگر میں متا کو تھپک دیتی۔

”مہر..... بس کچھ دیر اور..... وہ آتا ہی ہوگا..... مجھے انصاف دلانے.....“

ہے جو مجھے سب سے زیادہ جانتا ہے..... نہ صرف جانتا ہے بلکہ مانگتا بھی ہے..... اس کو

آجائے پھر میں پوری شان سے وہاں لوٹوں گی، اپنے گھر..... اپنی بچی کے پاس.....

وہ آجائے اس کے بغیر نہیں..... اس کے بغیر میں کیا ہوں.....؟ کچھ بھی نہیں وہ اسے

میں سر اٹھا کے اس حویلی میں جاؤں گی پھر کس کی مجال ہے جو مجھے نیرمی آنکھ سے بھی دیکھ

لے..... لیکن..... وہ آئے تو سہی..... وہ کیوں نہیں آتا.....؟

”خان زریاب آگئے“

میری آنکھیں پتھرا چکی تھیں رستہ دیکھتے دیکھتے جب کسی نے مجھے یہ اطلاع دی تو

میری پلک تک نہ جھپک سکی۔

”آگیا..... زریاب..... آگیا۔“ میں ننگے پیراٹھ کے بھاگی۔

”مومنہ..... رکو..... وہ نہیں آئے گا۔“ الٹی نے چیخے سے پکار کے مجھے روکنا چاہا۔

”مرڈانے میں اس وقت نجانے کون کون ہوگا ”رک جاؤ۔“

لیکن میں کیسے رکتی، بخار کی حدت سے تپتے میرے ننگے پاؤں ٹخنڈے کے فرش پہ مجلس مجلس کے پڑ رہے تھے۔ میرے کئی دن کے بکھرے روکھے بے ترتیب بال اور بھی اُجڑ گئے۔ میرے اس طرح بھاگنے سے بے پروائی سے سر پہ ڈالی چادر بھی نیچے لٹک رہی تھی۔ حجرے کے پاس میرے پاؤں کے انگوٹھے میں چادر کا کونا پھنسا اور میں منہ کے بل دروازے پہ گر گئی، دبلیز پہ ایک اکھڑا ہوا کیل میرے ہونٹ پہ لگا اور دور تک بازک ماس اویٹر گیا۔ میں پاؤں سہلاتے ہوئے چادر کا کونا لبوں پہ رکھ کے خون دبار ہی تھی کہ اندر سے زریاب کی آواز آئی۔

”مومنہ کہاں ہے؟ میری بیوی کہاں ہے؟“

مجھے جھپٹا گیا جیسے اسے دیکھے صدیاں بیت گئی ہوں۔ میرے اندر کی اداسی کو اس کی آواز نے اور پھر کاکھٹانے سے پہلے میں نے درد کی شدت میں دباتے ہوئے بڑے اشتیاق سے ادھ کٹے دروازے سے اندر جھانکنا چاہا اور..... میں دھک سے رہ گئی..... فیروز لالہ کا گریبان زریاب کی گرفت میں تھا اور اس کی رائٹل کا رخ لالہ کے سینے کی جانب۔ اس وقت اولہ کے چہرے پہ بچی کی بے یقینی تھی جس نے ایسا کی مجھے جکڑ کے بت کر دیا تھا۔

”میں پوچھ رہا ہوں کہ میری بیوی تمہارے پاس ہے؟“

”ہاں..... وہ اندر.....“ لالہ کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی زریاب نے اسے ایک زور کا جھٹکا دیا، اس کی آنکھیں جوش سے باہر اٹل رہتی تھیں وہ مجھے بالکل اجنبی سا محسوس ہو رہا تھا..... ہاں بالکل اجنبی اتنا اجنبی تو وہ مجھے تب بھی نہ لگا تھا جب میں نے اسے اپنے بچے کی بار دیکھا تھا۔

”مجھے صرف اتنا بتا دو کہ تم اسے زبردستی لائے ہو یا وہ اپنی مرضی سے آئی ہے؟“

”میں کیوں زبردستی کروں گا؟“ کچھ نہ سمجھنے کی کیفیت میں بھی لالہ نے نکل سے کام

لینے کی پوری پوری کوشش کی۔

”وہ اپنی خوشی سے، اپنی مرضی سے میرے ساتھ آئی ہے۔“ اس کے اتنا کہتے ہی

زریاب آپے سے باہر ہو گیا۔ رائٹل کے بٹ کے زور پہ اس نے لالہ کو نیچے گرا دیا۔

”بے غیرت کتے“ یہ اعتراف میرے سامنے کرتے ہوئے تجھے ذرا بھی غیرت نہیں

آ رہی..... اور کہاں ہے..... کہاں ہے وہ ناگن وہ بے حیا بے وفا عورت..... کہینی

نسل کی عورت..... جسے عزت راس نہ آئی..... بلا اسے..... اس کے سامنے میں تیری لاش
گراؤں گا..... تیری، جس کے ساتھ وہ اپنی ”خوشی“ اور ”مرضی“ سے آئی ہے اور اسے
..... اسے میں یہاں نہیں ماروں گا..... بے وفا ہی سہی ہے تو میری بیوی..... اس کے نام
کے آگے میرا نام لگا ہے، اس کی ناپاک لاش میرے ہی گھر میں گرے گی۔ میں اس کا خون
بھی کسی غیر زمین پہ بہانا پسند نہیں کرتا..... وہ کیا جھکتی ہے میرے جیتے جی دوسرا یار: ہونڈ
نکالے گی۔“

”زر..... یاب.....“ آنکھیں پھاڑ کے اس کے زہرا گھٹتے لہجے پہ غور کرنے والا فیروز
لالہ جیسے کسی خواب سے جاگ کے دھاڑا تھا۔

”زریاب..... ہوش میں رہ کے بات کرو..... وہ دونوں ستم گتھا ہو گئے۔ یہاں
طرح سگی مورنی کی طرح جیسے دہلیز پہ نصب ہوئے انہوں نے اپنے سے انداز میں انداز بھانگی
رہی۔ مجھے زریاب کے بلاکت میں ڈال دینے والے جملے بھی لیں گے تھے اور فیروز
لالہ اور اس کا ایک دوسرے پر جھپٹنا بھی رکھائی دینے پر ہوا تھا۔ لیکن میں کچھ کرنے کے
قابل نہ رہی تھی۔ میرے ہونٹوں سے خون فک کے مٹی میں گر رہا تھا اور پتھرائی ہوئی بے
یقین آنکھوں سے بے آواز آنسو اس خون کو پتلا کر کے ان میں جذب ہو رہے تھے، مجھے
لگ رہا تھا جیسے اب کبھی میں بل سکوں گی نہ ہی بول پاؤں بھی۔ جاگتے جاگتے آواز دینے
مجھے ہلا کے رکھ دیا اور میرے اس گمان کو توڑ کے رکھ دیا، گہری ناکوں پہ اٹختے ہوئے میں
نے آخری بار فیروز لالہ کو خون میں لت پت زمین پہ گرے دیکھا۔

جگرے کے دوسری طرف سے بہت سے بھاگتے قدموں کی آوازیں آنے لگیں۔
شاید فائر کی آواز نے ملازمین کو بھی چونکنے پہ مجبور کر دیا۔ میں نے زمین پہ گری چلا کر
انٹائی، اپنے گرد بیٹھی اور دہاں سے بھاگ کھڑی ہوئی۔“

مومنہ خاموش ہو گئی تھی لیکن دروازے کے اس طرف کھڑی مقدس اور دوسری جانب
اس کے قریب ہی بیٹھا خوشنود..... دونوں کتنی ہی دیر اس کے دوبارہ بولنے کے منتظر
رہے۔ لیکن..... مومنہ کے خشک لب سختی سے ایک دوسرے میں پیوست ہو گئے تھے،
نخنہ نخنہ ستارے پر دئے ہوئی پلکیں بنہ ہو گئی تھیں۔ پہنوں کی ہلکی سی لرزش اس بت میں
جان ظاہر کر رہی تھی۔

”پھر.....؟“ خوشنود اگرچہ اس سے پہلے بھی کئی بار اپنے دادا اور تایا سے باپ کی
الٹا ک موت کا واقعہ سن چکا تھا لیکن اتنی تفصیل سے سننے کے بعد اور وہ بھی ایسی ہستی کی

زبانی جس نے اسے اپنی آنکھوں سے زندگی سے موت کی جانب جاتے دیکھا تھا، ایک
عجیب سی ٹکان اور اداسی محسوس کر رہا تھا۔ ایک طویل سرد آہ بھرنے کے بعد اس نے کافی دیر
سے خاموش ساکت لیٹی مومنہ کو مخاطب کیا۔ اس کی پلکوں میں خفیف سی جنبش پیدا ہوئی۔

”پھر.....؟ پھر بیس سال..... وہ بیس سال صرف میرے تھے ان بیس سالوں میں
اور کوئی نہیں..... نہ زریاب..... نہ فیروز لالہ..... نہ مقدس..... نہ کوئی اور..... بس میں ہی
میں..... بلکہ شاید میں بھی کہیں نہیں تھی۔ بس یہ بیس سال تھے..... خالی..... تنہا اکیلے.....
بیس سال..... ان کا کیا بتاؤں تمہیں..... تم جاننا چاہتے تھے وہ میں نے بتا دیا ہے وہ بھی
صرف اس لیے کہ تم نے فیروز خان وردگ نے کا بیٹا ہونے کا حق استعمال کرتے ہوئے مجھ
سے کچھ کیا تھا، اور اس کے اور آئی کے مجھ پہ بہت سے قرض ہیں۔“ وہ اٹھنے کی کوشش
کرنے لگی۔

”خوشنود.....“ اس نے کہا۔ ”مومنہ نے کہا تھا کہ تمہارا باپ بے موت ضرور مارا گیا لیکن
بالکل بے قصور۔ وہ محبتوں کا ایک حوالہ آدی تھا۔ جہاں جاتا رشتے بنا لیتا یہی رشتے اسے اُس
گئے۔ زریاب نے اس کے ہاتھوں کو مٹی میں رول دیا۔ اس دن صرف فیروز لالہ نہیں مرا
تھا۔ اس کے علاوہ کئی اور مر گئے۔ مٹی کی مٹی ہوئی تھی، سچائی کا خون ہوا تھا۔ میں بڑی سے بڑی قسم
انٹائی و تیار ہوں۔ وہ شخص..... تو کیا کسی عورت کو غلط نظر سے نہیں دیکھ سکتا تھا مجھے تو ہرگز
نہیں۔ اس لیے بھی کہ اس..... مجھے بس کہا بھی نہیں مانا بھی تھا اور اس لئے بھی کہ میں
زریاب کی بیوی تھی، لیکن زریاب کی جسے اپنا سب سے قریبی دوست کہتا تھا وہ اور اس
زریاب نے کہا۔“

بیس سالوں سے مرے ہوئے دل میں اچانک ایک شدید حرکت پیدا ہو جاتی
ہے، جیسا مجھے اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ نجانے زریاب کی طرح اور کتنے لوگ ہوں
گے جو اس کے اور میرے رشتے کو بدگمانی کی نظر سے دیکھتے ہوں گے۔ میرا بس چلے تو اپنی
جان دے کے بھی سب کو یقین دلا دوں کہ وہ میرا لالہ تھا میرا بھائی..... صرف اور صرف
بھائی۔ تم..... تم تو یقین کرتے ہو ناں میری بات کا۔“ اس کے سر ہلانے پر مومنہ نے
سکون سے تکیے پر سر رکھا دیا۔

”تو تمہاری سلی ہو گئی اب۔“
”لیکن.....“ دروازے نے بے آواز حرکت کی اور مقدس دو قدم اندر چلی آئی۔
اس کی آواز پہ خوشنود بری طرح چونک کر پیچھے پلٹا۔ مومنہ بھی ایک جھٹکے کے ساتھ ساتھ

اٹھ بیٹھی اس کی پھٹی پھٹی آنکھیں ہلکے نیلے شلواری تھیں اور سفید بڑی سی چادر میں ملبوس اس کم عمری ”مومنہ“ پہ جی تھیں جس کے چہرے پہ اتنی ہی تھکان تھی، آنکھوں میں اتنی ہی ویرانی تھی، جتنی کہ اس بستر پر پڑی ”مومنہ“ کی آنکھوں اور چہرے پہ تھی۔

”لیکن میری تسلی نہیں ہوئی..... میری..... یعنی مقدس زریاب خنک کی..... بہت سے سوال ہیں جن کے جواب مجھے چاہئیں..... اگر ڈاکٹر خوشنود نے اپنے سوالات کے لیے فیروز علی وردگ کا بیٹا ہونے کا حق استعمال کیا ہے تو میں زریاب خنک کی بیٹی ہونے کی حیثیت سے آپ سے کچھ پوچھنا چاہتی ہوں زریاب خنک جو آپ کا شوہر ہے..... اب بھی..... ابھی تک..... آپ..... آپ..... مومنہ علی..... آپ میری ماں ہونے کی حیثیت سے مجھے جواب دہ ہیں۔“

وہ آہستہ آہستہ چلتی اپنی بات سہل کر کے بولنے لگی۔ مومنہ نے کمر ہاتھ دے کر اس کی بات سنی اور اس کی بات سمجھنے کی کوشش کرنے لگی۔ اگر وہ کچھ سنا رہی ہو تو تب بھی اسے سیکنڈ نہ لگتا مقدس کو پہچاننے میں وہی پیشانی..... وہ سنہری رنگت..... ہلکے ابروؤں پہ قطار کے ساتھ بنے وہی بھورے تین تل..... جو اس کے چہرے پر قدرتی تھے..... اور وہی نیلی کانچ سی دھلی دھلی آنکھیں۔

”یوں لگتا ہے جیسے نیلم کے ٹکڑوں کے گرد کسی نے ہیرے پورے پورے بکھیر دیئے ہوں۔“ اس کی پلکوں پہ ننگے آنسو دیکھ کے مومنہ کو وہ بات یاد آئی جو زریاب نے اسے چھٹی بار روتا دیکھ کے کہی تھی۔ اس نے سالوں سے سنے بازو اپنی بیٹی کے لیے پھیلا دیئے۔ اس کا دل اچھل اچھل کے پسلیوں تک بچنے لگا اپنی لاڈلی کوچہ والی..... لیکن وہ دل خود ہی تیراں سا ہو کے رک گیا..... وہ بازو خود ہی پشیمان سے بولے ہوئے میں دوبارہ آگرے جب اس نے مقدس کو کسی جذبے اور احساس کے بغیر وہیں کھڑے خود کو گھورتے پایا۔

”تو تم بھی تم بھی ان میں سے ہو جنہیں یقین کرنے کے لیے میری جان کی ضرورت ہے..... آو..... مجھے خبر نہ تھی کہ میرا اپنا خون بھی مجھے بے اعتبار جانے گا۔“

”میں یقین کر سکتی ہوں بلکہ مجھے یقین ہے ان سب باتوں کی سچائی کا جو آپ نے کہیں لیکن.....“ اس کے الفاظ پھر سے مومنہ کو زندہ کر گئے۔

”لیکن یہ آدھا سچ ہے۔ سچ کبھی ادھورا نہیں ہوتا۔ سچ کبھی مصلحت پسند نہیں ہوتا۔ سچ کبھی بزدل نہیں ہوتا..... سچ کو روپوشی کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ آپ کہہ رہی تھیں ناں

ابھی کہ میرا بس چلے تو اپنی جان دے کر سب کو یقین دلادوں کہ فیروز اور میرا کیا رشتہ تھا تو پھر..... آپ نے یقین کیوں نہ دلایا۔ آپ کے چہرے پہ ظلم کا یہ نشان گواہ ہوتا آپ کی بے گناہی کا۔ جو جھوٹ میرے باپ کو مشتعل کرنے کا سبب بنا تھا وہ اگر اتنا ہی بے بنیاد اور کھوکھلا تھا تو آپ ایک ہی دار میں اسے مسمار کر سکتی تھیں لیکن آپ نے ایسا نہ کیا..... آپ نے ایسا کرنے کی کوشش ہی نہ کی..... آپ فرار ہو گئیں..... کیوں..... کس لیے؟“ وہ پھٹ پڑی۔

”کیونکہ میں جانے لگی تھی پھولوں کے رنگ کالے کیسے ہوتے ہیں“ مومنہ نے سرگوشی کی، ایسی سرگوشی جسے صرف وہ ہی سن پاتی تھی۔

”آپ بتاتی کیوں نہیں ایسا کیا تھا جس کو چھپانے کے لیے آپ کو خود چھپنا پڑا؟“ ”بھئی نہیں۔“ وہ مضبوط نہ کر سکی اور اتنی نقابت کے باوجود چیخ اٹھی۔ اس کا بدن لرز رہا تھا اور رنگ زرد پڑ گیا تھا۔ خوشنود کے اندر کا ڈاکٹر بیدار ہو گیا۔ اس نے فوراً اٹھ کے نرس کو تیل دی اور اتنے عرصے میں پہلی بار مقدس کو مخاطب کیا۔

”مس مقدس..... ہو سکے تو آپ کل تشریف لے آئیے ان کی حالت ایسی ہرگز نہیں کوئی شدید اعصابی اور جذباتی جھٹکا سہہ سکیں۔“ اس نے اسے دیکھے بغیر پیشہ دارانہ سی حواس سے ان سنی کرتے ہوئے مومنہ ہانپتے ہوئے کہنے لگی۔

”کچھ چھپانے کے لیے فرار ہوئی تھی نہ ہی اپنی جان بچانے کے لیے۔ میں اس کے ساتھ ہوں۔ اس کے اس کے چھوٹی غیرت کی تسکین نہیں کرنا چاہتی تھی۔ میں..... میں تین دنوں میں یہاں سے اس کے انتظار میں راستے کا پتھر بنی رہی، اس کی راہ کتنی رہی۔ وہ مجھے کچھ کچھ بچا ہوا آئے گا..... میری حالت دیکھ کے اس کا خون کھول جائے گا..... مجھے ملنے والے ایک ایک زخم کا حساب لے گا وہ..... اور وہ آیا..... مجھے ایک نیاز خرم دینے کے لیے۔ میری رہی ابھی جان بھی نکالنے کے لیے..... مجھے مان دینے والے واحد شخص کو مجھ سے چھیننے کے لیے..... میں سبہ جاتی؟ بتاؤ میں ایسے ہی سبہ جاتی.....؟ میں کچھ نہ کرتی؟ میں نے بھی وہی کیا جو مجھے کرنا چاہیے تھا..... ایک ہاری ہوئی..... روندی ہوئی ریزہ ریزہ عورت کو کیا کرنا چاہیے تھا..... میں نے..... میں نے.....“ اس کی آواز ڈوبنے لگی۔

”میں نے وہی کیا..... بالکل ٹھیک کیا..... زریاب کے ساتھ یہی ہونا چاہیے تھا۔“ وہ نڈھال ہو گئی۔ خوشنود نے بے بسی سے نہ چاہتے ہوئے بھی مقدس کو دیکھا وہ چپ



چاپ لٹے قدموں باہر نکل گئی۔

نرس نے کچھ ہی دیر میں مومنہ کو پرسکون کر دیا۔ آکسیجن کی تالی اور مصنوعی دھڑکنوں کے سہارے وہ غنودگی کے عالم میں تھی۔ اس کا ہاتھ خوشنود کے ہاتھوں میں تھا۔ وہ اپنی الجھن سمجھنے سے قاصر تھا۔ اسے رورہ کے مقدس پہ غصہ آتا جو جاتے جاتے اسے بھی ایک سوال میں الجھا گئی تھی۔

اس عورت کے ایک ایک لفظ پہ ایمان لانے کو جی چاہتا تھا۔ خود اس کی ماں کی گواہی بھی کافی تھی اس لیے ہی تو وہ اتنی اپنائیت اور عقیدت کے ساتھ اسے پھوپھی جان کہتا تھا لیکن..... پھر وہ فرار۔ یہ اس کے گمان سے بھی باہر تھا۔ زریاب پہ اس کا غصہ سمجھ میں آنے والی بات ہے لیکن اولاد تک سے چھپ چکا تھا۔ زریاب کو تو قانون نے سزا دی تھی۔ یہ اس کی بات کہ بار بار کی اپیل نے سزائے موت کو عمر قید میں بدل دیا۔ لیکن پھر وہ سر جھٹک کے اٹھ کھڑا: داد۔

”نی الحال مجھے ان کے مکمل صحت یاب ہونے کا اندازہ سنا جا رہا ہے۔“ اس نے سوچا حالانکہ یہ بھی اچھی طرح جانتا تھا کہ جس قدر خراب حالت میں وہ اسے اٹھا کے اس ہاسپٹل تک لایا تھا، اس کے بعد اس کا نہ صرف زندہ بچ جانا بلکہ پورے ہوش و حواس کے ساتھ اتنی دیر گنتلو کرنا بھی ایک معجزہ ہی تھا اور اب ایک اور معجزہ ہی: دوگا اگر مومنہ ان مصنوعی سہاروں کے بغیر بھی زندہ رہے۔

وہ پوری رات اس نے موت سے لڑتے لڑتے گزاری۔ ہر بار ہوش میں آنے کے بعد اس کے لبوں پہ مقدس کا نام ہوتا اور پھر وہ ڈھے جاتی۔ اس کی ڈوبتی نبضیں اور تڑپتی دھڑکنیں خوشنود کو فکرمند کر جاتیں لیکن رات گزرتے ہی جیسے وہ غنودگی سے بے خبر ہو کر رہ گیا۔ شاید وہ خود بھی کسی کے دل میں اپنے لیے بدگمان اور خود کو پھوپھی سمجھتا ہو۔

”تم۔ تم خوشنود۔ تم کیسے جانتے ہو مقدس کو؟“ ذرا سنبھلتے ہی اس نے سوال کیا۔ ایسا سوال جس کا اصل جواب دینا شاید خوشنود کے لیے خود کو ہار دینے کے مترادف تھا۔ ”بس کچھ ہی دن پہلے اتفاقاً ملاقات ہوئی تھی لیکن درحقیقت وہ پہلے ہی آپ کی تلاش میں تھیں۔ انہیں کسی نے آپ کے لاہور میں ہونے کی اطلاع دے دی تھی۔ آپ کے ساتھ رہنے والی اماں برکتے تک تو وہ پہنچ ہی چکی تھیں اور ایک دن اماں کو میرے ساتھ دیکھ کے مجھ سے پوچھنے لگیں۔ پتا نہیں کیوں میرا دھیان اس طرف گیا ہی نہیں کہ ان کا

آپ سے کیا رشتہ ہو سکتا ہے، میں کچھ سوچے سمجھے بغیر آپ کے پاس لے آیا۔ مجھے ذرا سا بھی شبہ ہوتا تو پہلے آپ سے ذکر کر لیتا۔“

”میں نے کہا بھی تھا کہ کسی کو میرے متعلق پتا نہ چلے اور کیا تمہیں اس کی صورت دیکھ کے بھی کچھ محسوس نہ ہوا۔“

”ہوا تھا..... بہت کچھ محسوس ہوا تھا۔“ وہ کھویا کھویا سا سامنے رکھے پھولوں کو بے دھیانی سے تک رہا تھا۔

”تمہیں تو اسے دیکھتے ہی پتا چل جانا چاہیے تھا کہ وہ میری بیٹی ہے۔“

”میں نے کہا ناں.....“ وہ خود کو بھی بھلا بچکا تھا۔

”میں نے کہا ناں میرا دھیان کسی اور طرف گیا ہی نہیں..... اس سے ہٹا تو نہیں جاتا۔“ کچھ کچھ یاد نہ تھا نہ آپ کی ہدایت نہ کچھ اور..... وہ سامنے ہو تو پھر مجھے

”خوشنود“ مومنہ بے یقینی سے پکار رہی تھی۔ اس کی غبار غبار ہوتی آنکھیں جھٹک پڑیں اور وہ جیسے ہوش میں آ گیا۔ خفت سے اس کا گندی چہرہ سرخ ہو گیا۔ وہ کتنی ہی دیر اسے دیکھتی رہی۔

”خوشنود بس ایک بار اور میری مدد کرو۔ مقدس کو ایک بار میرے سامنے لے آؤ مجھے اسے دیکھنا ہے..... اب تو مجھے اس سے سب کچھ کہنا ہی پڑے گا۔ بات صرف میری نہیں ہے۔“ وہ اپنی جو مجھ سے شروع ہوئی تھی۔ وقت نے اس میں کتنے کردار شامل کر دیئے تھے۔

”میں نے اپنی ہندوئی ظاہر کی۔“

”میں نے اپنی ہندوئی ظاہر کی۔“

”وہ صرف تمہارے دشمن کی بیٹی نہیں تمہاری پھوپھی کی بیٹی بھی ہے اور تمہاری پھوپھی ان مہمان سانسوں کے ساتھ اپنی اکلوتی اولاد کو دیکھنے کی خواہش کر رہی ہیں۔ کیا تم اس کی یہ خواہش پوری کرو گے۔“

وہ چپ چاپ نمبر پش کرنے لگا۔

”نہیں ڈاکٹر خوشنود میں نہیں آ سکتی۔ جس ماں کی تلاش نے مجھے اتنا بھڑکایا، اس کے دل جانے نے مجھے اور الجھا دیا ہے جب تک وہ میری اس بات کا تسلی بخش جواب نہیں دیں گی کہ وہ کیا وجہ تھی جس نے انہیں اپنی اولاد تک کو فراموش کر دینے پہ مجبور کر دیا،

میں کبھی انہیں اپنی ماں تسلیم نہیں کروں گی۔ مجھے اپنی بچپن کی تمام خوفزدہ کردینے والی راتوں اور محروم اجاڑ دنوں کا حساب چاہیے۔“

”خدا سے دعا کیجئے کہ وہ آپ کی ماں کو اس حساب کتاب کے لیے زندہ رکھے۔“ اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

”جی..... کیا مطلب؟“

”مطلب یہ مس مقدس کہ آپ تسلیم کریں یا نہ کریں اس حقیقت کو جھٹلا تو نہیں سکتیں کہ وہی آپ کی ماں ہیں۔ ایک اکلوی اولاد ہونے کی حیثیت سے آپ کا فرض ہے کہ ان کے آخری وقت میں ان کے قریب رہیں۔ ان کے کیا فراموش تھے کیا نہیں، اس پر پڑنے کا فی الحال وقت نہیں ہے۔ اس کے صاف لسان کہتے ہیں کہ ابھی اس کی توقع کے نین مطابق آدھے گھنٹے کے اندر اس مقدس وہاں پہنچیں۔ اس نے کترا کے نکل جانا چاہا لیکن مومنہ نے ہاتھ سے روک لیا۔

”مقدس! میری بیٹی! کیا تمہارے دل میں میری ماں کے خلاف اتنا زہر بھردیا گیا ہے کہ برسوں بعد ملنے کے باوجود تم نے اپنی ماں کے گلے لگنا گوارا نہ کیا۔ میری بانہیں پھیلی رہ گئیں اور تم..... واپس چلی گئیں۔“

”آپ غلط سمجھ رہی ہیں میرے دل میں زہر ہے۔ میں کسی قسم کا کوئی شک آپ نے خود کچھ بھی کہا میں اس کا یقین کرتی ہوں اور آپ اور جو بھی بتائیں گی میں اس کا یقین کراؤں گی لیکن آپ بتائیں تو سہی۔ مجھے جواب تو دیجئے کہ مجھ سے..... میری ذات سے آپ کو کیا خطرہ ہو سکتا تھا جو آپ نے خود کو اتنا حساس کر لیا۔“

”مجھے تم سے کیا خطرہ ہو سکتا ہے؟ مجھے کسی سے..... میری خوفزدہ تھی۔ اپنے اندر کی محبت کی ماری عورت سے ڈرتی تھی، اپنی ممتا سے خائف تھی مجھے خطرہ تھا تو اس بات سے کہ کہیں میرے اندر کی محبت پھر مجھ پہ حاوی نہ ہو جائے۔“

”اپنی اولاد سے محبت کرتے ہوئے ڈرتی تھیں آپ کیوں؟“ وہ بے بسی سی گرنے کے انداز میں نزدیکی کر سی پہ بیٹھ گئی۔

”میں آپ کی یہ بہم باتیں سمجھنے سے قاصر ہوں۔ کیا اتنے سالوں میں کبھی آپ کو مجھے کھودینے کا مال نہیں ہوا۔ کبھی بھی آپ میرے لیے نہیں تڑپیں۔ کبھی میرے لیے نگر مند نہیں ہوئیں؟“

”میں نے تمہیں کھویا نہیں تھا مقدس میں خود کھو گئی تھی اور دیکھو آج تمہیں مل گئی

ہوں۔ تم مجھ سے جدا نہیں ہوئی تھیں صرف میری آنکھوں سے اوجھل ہوئی تھیں پھر ملال کس بات کا۔ ہاں کسک تھی سو وہ تو نصیب کا ایک حصہ جان کے سنبھال لی سینے میں۔ میں تو یہ جان کے خود کو مطمئن کر لیتی کہ تم اپنوں میں ہو۔ اپنے باپ کے گھر..... اپنے خاندان کے ساتھ..... ایک مضبوط چھت کے نیچے۔“

”ہونہہ..... اپنے۔“ وہ اداسی سے مسکرائی۔

”میں نے بیس سال اندھیرے میں ٹھوکریں کھاتے گزارے ہیں۔ عمر کا آدھا حصہ..... ہاں وہ حصہ جس میں کسی بھی انسان کو ہاں باپ کی سب سے زیادہ ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ وہ حصہ میں نے ان دونوں رشتوں سے یکسر انجان رہتے ہوئے گزارا۔ بیکت سے لوگوں کے ماں باپ نہیں ہوتے، کئی لوگ پیدائشی متم ہوتے ہیں لیکن وہ کم از کم اتنا تو جانتے ہیں کہ ان کے باپ کی قبریں کہاں ہیں؟ وہ کون تھے کیسے تھے؟ اور میں..... میں تو اتنا بھی نہیں جانتی تھی میرے ماں باپ زندہ ہیں یا پھر.....

میں تو اپنی ماں کے نام سے بھی انجان تھی۔ بیس سال بعد میں جان پائی کہ وہ دونوں زندہ ہیں اسی زمین کے کسی کونے پہ موجود ہیں۔ بابا جان کے مجھ سے دور رہنے کی وجہ کیا تھی..... مجھ میں آتی ہے۔ لیکن آپ تو آزاد تھیں پھر کیوں یہ خود ساختہ دیواریں کھڑی کر لیں۔“

”آزاد کب تھی..... میں آزاد کب ہوں۔ تم جانتی ہو مقدس پھولوں کے رنگ..... میں بھی نہیں جانتی تھی..... تمہارا باپ جانتا تھا لیکن وہ مجھے بتا نہیں..... مجھ میں خود کو جاننے لگی جب کسی پھول کو محبت کا پانی ملنا بند ہو جائے..... کی جڑوں میں زہر اتر جائے تو آہستہ آہستہ وہ کالا پڑنا شروع ہو جاتا ہے۔ میری جڑوں میں بھی ایک دم زہر ملی ہوئی تھی..... میرے دل کے کالے پن نے مجھے یہ سب کرنے پہ مجبور کیا۔“

”کیا؟“ وہ بے تابی سے بول اٹھی لیکن مومنہ کا دھین اس پہ نہیں تھا وہ اپنی ہی کہتی رہی۔ ”اور جانتی ہو اس پھول سے نازک دل کو کالا کس نے کیا۔ نفرت نے..... نفرت چیز ہی ایسی ہے، پیار چاہے تو پتھر میں بھی خوشبو بھردے اور نفرت..... نفرت بھی کمزور جذبہ نہیں۔ نفرت چاہے تو پھول میں آگ لگا دے۔ مجھ جیسی محبتوں کی ماری کو چھلکا کے سراپا شعلہ کر دے میں نے اس نفرت کو سنبھال کے رکھ لیا اس نفرت کے بغیر میں بڑی کمزور تھی۔ محبتیں کمزور بنا دیتی ہیں نا..... میں نے نفرت کے سہارے مضبوط بنا چاہا، اتنی سنگدل بنا چاہتی تھی میں کہ.....“ وہ بولتے بولتے رک گئی اک نظر دونوں کو دیکھا۔

خود ساختہ معاشقے کی تفصیل اتنے بے رحم الفاظ کے ساتھ بیان کرتے ہوئے وہ بھول گئیں کہ بھلے اپنے اصل سے وہ کتنا ہی دور دور رہا ہو، ہے تو ایک ”خانزادہ“ ہی جسے غیرت سے آگے کچھ سوچتا نہیں۔ اسے بھی کچھ نہ سوچا۔ پل بھر میں جان سے عزیز بیوی اور قابل اعتبار یار کے خون کا پیسا بن گیا اور یہ پیاس اسے پچاسی کے تختے تک لے گئی۔

زر سانگہ اپنی حرکت کا اتنا سخت انجام سہہ نہ سکی اس کے دماغ کی شریان پھٹ گئی۔ وہی حالت تو اس کی دن بدن کمزور ہوتی ہی جا رہی تھی یہ آخری اور شدید جھٹکا اس کا کمزور دماغ سہہ نہ سکا اسے برغم سے بے نیاز کر گیا۔

خان جی، وہ تو تب ہی لڑکھڑا گئے تھے جب ان کا بیٹا خون کی ایک نئی تاریخ رقم کرنے چلا تھا۔ ان کو فالج کا سپاہ حملہ اسی دہائی کا تھا پھر زریاب کی گرفتاری، موت کی سزا، بیوی کی اچھا تک موت، یہ سب حادثات انہیں ابلتر تک کا ہی کر گئے۔ برسوں سے وہ اپنے رعب و دبدبہ والے اہل بیچھے خان جی کو بسرا پہ مفلوج بے بس، بے زبان پڑا دیکھ کے کڑھ رہی تھیں۔ لیکن جو جھوٹ بول دیا تھا وہ بھاننا تو تھا ہی۔ اب سچ کہہ بھی دیتیں تو کیا ہو جاتا۔ کیا فیروز زندہ ہو جاتا؟ زریاب آزاد ہو جاتا؟ یا زر سانگہ اوٹ آتی؟ وہ چپ چاپ اس چنگیاں بھرتے خمیر کو نظر انداز کرتی رہیں اور مقدس اس کی صورت ایک سال تذاب ان کے سر پہ بیس سال تک مسلط رہا۔

مقدس کی صورت میں ایک چلتی پھرتی مومنہ کیا کم سزا تھی ان کے لیے۔ اس کی صورت میں وہ سارا واقعہ بھولنے نہ دیتی راتوں کو اس کا چل چل کے رونا ان کے دل میں لگتا تھا۔ اس کے لیے مومنہ کے میں گھنوں گھنوں چل کے جاتی اپنی ماں کو ڈھونڈتی پھرتی وہ رونی

صورت میں اپنی مومنہ خود سے ہمال کرتی محسوس ہوتی۔ وہ چڑ جاتی اس کے سامنے کم سے کم اس کے مخاطب کرنے کی نوبت تو اکثر آتی ہی نہیں تھی۔ وہ چاہتی تھیں اس حویلی کی تاریخ لے مومنہ کا باب ہی مٹ جائے۔ کسی کو یاد نہ رہے کبھی زریاب کی کوئی بیوی یہاں

آئی بھی تھی اور اس میں وہ خاصی حد تک کامیاب رہی تھیں۔، بڑی بہو یہاں نہ ہونے کی وجہ سے سارے قصے سے لاعلم تھی ہی، چھوٹی بہو اس واقعے کے کئی سال بعد آئی۔ سب مومنہ کے بارے میں وہ ہی جانتے تھے جو بی بی جان نے زریاب سے کہا تھا۔

درا ب بھائی کی طرف سے ملنے والی شادی کی تصویروں میں سنہری بالوں، گلابی زور سنہری رنگت والی، بلور سی آنکھوں والی بھابھی کو غیر ملکی ہی سمجھا اور کسی نے اس کی یہ غلطی بھی عرصہ تک دور کرنے کی کوشش نہیں کی۔ نتیجتاً اکثر لوگ یہی جانتے زریاب کی بیوی کوئی ”میم“ تھی۔ اس کا ذکر اس گھر میں مومنہ تھا۔

”کہ زریاب کو سزا سنا تے ہوئے میرا دل نہ کانپے۔“

”مگر زریاب خٹک کو قانون نے سزا دی تھی۔“ اب تک لا تعلق بیٹھا خوشنود کہہ اٹھا۔

”ہاں..... قانون نے ہی سزا دی تھی۔ فیروز لالہ کے قتل کی..... لیکن..... زریاب

قاتل نہیں ہے۔“ مومنہ نے کہا۔

”کیا کمایا تو نے حضرتی؟“ بی بی جان نے اپنے گورے، پھولے پھولے مگر گہری

لکیروں سے جچی سخت ہتھیلی والے ہاتھ بغور دیکھتے ہوئے خود سے سوال کیا۔

”زندگی میں سب کچھ ”بھرم“ ہی تو نہیں ہوتا۔ کیا ہوتا ہے یہ ”بھرم“ اتنی کھوکھلی

چھت... اتنی بلکی چادر... یہ کیا سر چھپائے گی۔ پھر بھی فقط اسے سلامت رکھنے کے

لیے انسان سب کچھ داؤ پر لگانے کو تیار ہو جاتا ہے۔ یہ بھرم ہی تو تھا جس نے اتنے سالوں

تک یہ کھیل بھجھ سے کروایا۔ یہ ٹھیک ہے کہ پہلے بی بی جان نے یہ سب کچھ سچو سچو کیا

لیکن پھر..... پھر کیا ہوا..... نہ بی بی جان کی خوشیاں سب بھاننا ہی تھیں۔ مومنہ نے

ہو گیا..... اس کے بعد صرف یہ کم بخت بھرم ہی تو رہ گیا تھا جسے بچانے کے لیے اتنے

سال تسلسل سے پتہ تاشا ہوتا رہا۔ کیسے اپنے بچوں کی نظر میں خود کو باکا کرتی میں، اپنے

گناہوں کا اعتراف کر کے، لیکن وقت سے بڑا جابر اور کون ہے..... مونا ہی لیا مجھ سے

سب کچھ..... اگر یہ سب یونہی ہوتا تھا تو..... درمیان میں کیوں آئے اگر اتنے

مجھے اپنی اولاد کی نظروں سے گرتا ہی تھا تو کیوں بے کار اتنی زندگیاں برباد ہوئیں۔

وہ خاموشی سے اپنا احتساب کرتی رہیں۔ تمام قصہ کہہ دینے کے بعد وہ وہاں نہیں

سکیں۔ زریاب کی حیران بے اعتبار اور افراسیاب اور دراب کی ملاستی نظروں کی ڈوبتا نہ

لا سکیں۔ پچھلے کئی گھنٹوں سے وہ اپنے اندھیرے کمرے میں بیٹھی تھی۔

ڈھونڈ رہی تھیں۔

بے شک خمیر نے یہ کوزہ آج پہلی بار لہرا کے انہیں مارا تھا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں

تھا کہ بیس سال تک ان کا خمیر دل کے کئی کونے میں سویا رہا تھا۔ وہ تو عرصے سے چنگلیں

بھر رہا تھا اور اس نے تو پہلی چنگی تب بھری تھی جب ان کی آنکھوں کے سامنے زریاب

بندوق لہراتا ہوا نکلا تھا۔

انہیں اپنے اقدام کے سنگین نتائج کا اندازہ تب ہی ہو گیا تھا۔ وہ تو سمجھتی تھیں

زریاب بیوی سے بدگمان ہو کے اس سے تعلق توڑ لے گا اور یوں وہ بڑی آسانی سے مومنہ

کا پتہ صاف کر پائیں گی لیکن زریاب خٹک جیسے بختوان النسل کے سامنے اس کی بیوی کے

”وہ ہوتی تو میں اس سے بھی معافی مانگ لیتی۔ میں صرف تمہاری ہی مجرم نہیں ہوں میں اس عورت کی مجرم بھی ہوں جو نجانے کتنے خواب آنکھوں میں سجا کے اس گھر میں سہاگن بن کے آئی تھی۔ میں اس معصوم بچی کی مجرم بھی ہوں، اپنے بیٹے کی..... اپنے دل کے ایک ٹکڑے کی..... میں نے تمہیں برباد کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔“

”نہیں بی بی جان.....! آپ کم از کم میری مجرم تو نہیں ہیں۔ میں اپنی بربادی میں کسی کو قصور وار نہیں ٹھہرا سکتا۔ آپ کو بھی نہیں۔ اپنی بربادی میں سب سے بڑا ہاتھ خود میرا ہے میری بے اعتبار محبت کا۔ بلکہ آپ تو مومنہ کی مجرم بھی نہیں اس کا سب سے بڑا مجرم میں ہوں۔ میرے اندھے جذبات اور جنون اسے لے ڈوبے۔ اپنی بیٹی کی تمام تر ذمہ داریاں میری ہی ہیں۔ اس سارے قصے میں مجھے اور تو کوئی مجرم نہیں دکھائی دیتا سوائے میرے۔ یہ میں ہی تھا بی بی جان..... یہ میرا کمزور عشق تھا جو بدگمانی کا ایک ہلکا سا دار نہ لہے۔ کیوں معافی مانگتی ہیں بی بی جان..... معافی تو مجھے مانگنا ہے مقدس مومنہ سے.....“

”زر..... تم نے..... حضرت کو..... معاف..... بیٹا..... اپنی بہن..... بہن کو..... بھی.....“

”ہاں زریبا..... اپنی بہن کے لیے تمہارے دل میں جو گلے شکوے ہیں، وہ دور دوری..... اس کی روح کو چھتاوے کے بوجھ سے آزاد کر دو..... اس کی بخشش کے لیے دعا کرو.....“

”بی بی جان نے التجا کی..... میں نے کہا ناں بی بی جان..... میرے دل میں کسی کے خلاف کوئی شکوہ نہیں۔ اس دل میں اپنے ہی حال اس قدر ہیں کہ.....“

”وہ بات ادھوری چھوڑ کے اٹھ کھڑا ہوا۔“

”بی بی جان نے التجا کی.....“

”اندر ہی اندر کہیں بہتار بتا ہے زندگی کے درد کا پانی اور یہ درد تو میں نے خود مہمان کیا ہے..... یہ پچھتاوے تو میں نے خود آگے بڑھ کے خریدے ہیں۔ وہ سارے عہد وہ سارے پیمان میں نے ایک پل میں بھلا دیئے مجھے کچھ بھی یاد نہ رہا۔“

اس کے صبح چہرے پہ نور کا وہ ہالہ اس کے نکھرے سچے لہجے میں کوکتے وعدے اس کی شفاف آنکھوں کے آئینے

شاید رفتہ رفتہ لوگ اس قصے کو یکسر فراموش کر دیتے اگر..... مقدس کا وجود نہ ہوتا۔ اس لیے وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے بے ضرر وجود سے نفرت کرنے پہ مجبور ہو گئیں اس کی سوال کرتی آنکھیں انہیں زہر لگتیں ایسا لگتا جیسے مومنہ سامنے آنکھڑی ہو اور کہہ رہی ہو۔ ”کیوں؟ بی بی جان کیوں؟“

”آہ کیوں؟“ وہ خود کو کوسنے لگیں۔ ”کیوں میں ایک مومنہ کے بعد دوسری مومنہ سے کھیلتی رہی۔ کیا اس کی ماں کافی نہیں تھی میری نفرتوں کی تسکین کے لیے جو میں اس معصوم سے بھی بدلے لیتی رہی شاید میں ڈرتی تھی وہ اس قابل نہ ہو جائے کہ اپنی ماں کا بدلہ مجھ سے لینے میرے مقابل آجائے۔ ہائے حضرت تو نے کیا کیا..... کیا زریبا کا اس کی نسل کا اس خاندان پہ کوئی حق نہ تھا کیا اس کے حصے کی خوشیاں ہی رو گئی تھیں تیری بیٹی پہ قربان ہونے کے لیے۔ تیری بیٹی سے وہ در بھر ہوا، اس کا گھراؤ اس کی بیوی رسوا ہوئی پھر بھی تو نے بس نہ کیا اس کی معصوم امانت تک کو کچھ بھی نہیں دیکھا کیوں ہوتی آنا.....“

وہ اٹھیں اور خان ارباب خنگ کے کمرے میں داخل ہو گئیں۔ کئی دنوں سے بے چین اور مضطرب خان ارباب خنگ کے ضعیف چہرے پہ اس وقت اطمینان پھیلا ہوا تھا۔ ان کا ابھری رگوں والا انبساط ابھی تک زریبا کے ہاتھوں میں تھا بلکہ شاید جب سے وہ لوٹا تھا یہ ہاتھ تھا، ہونے چاہئے تھا، وہ تھکے تھکے قدم چلتی ان کے سر ہانے پہنچ گئیں۔

”خان جی!“ انہوں نے سرخی مائل سوچی آہیں جھکائے جھکائے عرض کی۔

”خان جی! مجھے معافی دلادیں، مجھے زریبا سے معافی دلادیں خان جی.....“

”بی بی جان! مجھے گناہ گار مت کیجئے اس طرح میرے سامنے ہاتھ نہ چھوڑو۔“

”اس نے سنا تو کیا ہے؟“ اس نے سنا تو کیا ہے؟

”میرے دل میں کسی کے خلاف کوئی شکوہ نہیں۔“

”میرے دل میں کسی کے خلاف کوئی شکوہ نہیں۔“

”میرے دل میں کسی کے خلاف کوئی شکوہ نہیں۔“

اور اپنا وہ وعدہ..... جو میں نے کبھی بڑے سچے دل سے کیا تھا۔" اسے یاد آنے لگا۔
 "میں تان دوزخ سڑساں
 جے میں مکھ ماہی ولو موڑاں"

اور میں نے مکھ موڑ لیا..... کس سفاکی کے ساتھ... کس بے دردی کے ساتھ اور کس
 بھدے پن کے ساتھ۔

سالوں بعد آج وہ اس کمرے میں موجود تھا جس کی دیواریں اس کے جنون خیز عشق
 کی ہر ہر ادا کی راز دار تھیں۔ وہ جدھر جدھر جاتی زریاب اسے نکلے جاتا۔
 آئینے کے سامنے پل دوپل رک کے ریشمی بالوں کی پہلے سے کی گئی چوٹیوں کے بل

اور کستی ہوئی اکتائی اکتائی سی موٹھی.....
 "اُف یہ بال، کتنی سکھی تھی میں تانی کے بال گھبرا کے دو دو دن گزرے ہوں
 اور اب....." وہ مڑ کے شکایتی نظروں سے دیکھتی۔
 "تسباری نئی نئی فرمائشیں..... مینڈھیہا..... کس کے چھوڑو..... وغیرہ
 وغیرہ..... بھلا تمہیں میرے بالوں سے کیا؟"

"کیا کہا؟ پھر سے کہنا" تکیے پہ سر رکھے ہوئے اسے دیکھتے دیکھتے وہ اچانک اٹھ
 بیٹھا۔ "مجھے کیا؟ مجھے نہیں تو اور تمہیں مطلب ہوگا ان بالوں سے؟ اتنے خوبصورت ریشمی
 اور لمبے بالوں کی قدر ہی نہیں عجیب رسیاں سی بن کے جان بھیلانہ تھی سر پہ اور اب
 کون سا میری "نئی نئی فرمائشیں" پوری ہو رہی ہیں۔ بال کھلے رکھنا تو ایک طرف تم میری
 پسند کے مطابق ڈھیلے سے بل دالی چوٹی بھی نہیں کرتیں کس کس کے یہ دو پہنکے لگا لیتی
 ہو۔" وہ اس کی دو چوٹیوں پر تنقید کرتا۔

"کیا کروں، ڈھیلے بالوں میں سر بچھنے لگتا ہے۔ اتنے سناپوں کی عادت ہو ہے۔
 رنگ جاؤں گی آہستہ آہستہ تمہارے رنگ میں صیب۔" جب کبھی وہ رنگ میں ہوتی
 تو اس کے جڑنے کے باوجود اسے "صیب" کہہ کے ضرور پکارتی۔
 "سنو!" اس کا لہجہ بدل جاتا اسے آئینے کے آگے سے ہٹے دیکھ کے۔
 "تم کچھ دیر اور کھڑی رہو ناں یہاں۔"

"کیوں؟"
 "اچھا لگتا ہے تمہیں ایک نظر میں ہی "دودو" بارد کیٹنا۔" اس کی وارفتگی پہ اس کے
 نین شہد پنکھانے لگتے۔

وہ آہستہ آہستہ چلتا اس درتچے کے قریب آیا جہاں صبح صادق کے وقت بیٹھے کے
 عبادت کرتا مومنہ کو بے حد پسند تھا۔ زریاب بھی صبح خیز تھا لیکن اس نے تو شاید کبھی ہٹ پھٹنے
 کا انتظار بھی نہیں کیا ہوگا۔ سورج کی پہلی کرن کو خوش آمدید کہنے کے لیے وہ ہمیشہ اس
 درتچے کے پردے ہٹا کر کھڑی ہو جاتی اور جب وہ جاگتا اسے ڈھونڈتا ہوا سیدھا ہمیں
 آتا، اسی درتچے کی طرف جو اس کے کمرے کے ساتھ متصل اسنوڈیو کی پچھلی طرف کھلتا
 ہے۔ اس نے گرد اور سیلن سے بھری اسنوڈیو کی فضا میں سانس لینے میں دشواری سی محسوس
 کی۔ پرانے کاغذوں کے ڈھیر نے عجیب سی مہک پیدا کر رکھی تھی، اور خشک ہوتے چٹت
 سیلن زدہ سی بدبو پیدا کر رہے تھے۔ اس نے آگے بڑھ کے پردے کھینچے۔ مختصر سی بالکونی
 میں پتھر کا وہ بیچ آج بھی موجود تھا لیکن اس پہ چابن کے گہرے گہرے رنگ والے پتوں کا
 سایہ پڑھا تھا ایک ٹنڈ ٹنڈ منڈ منڈ اور سنت افسردہ سا جیٹا تک کے نجانے کسے ڈھونڈ رہا تھا۔ بیچ کے
 ساتھ ابھی بھی قطار میں وہ کھلے گئے تھے لیکن انہ تو ان میں گلاب باقی تھے نہ موتیا۔ وہ تھکا
 تھکا سا اس گرد میں آسے بیچ پہ بیٹھ گیا لیکن اگلے ہی لمحے تڑپ کے اٹھا تھا جیسے یہاں، اس
 مقام پہ بیٹھ کے اس سے کوئی بے ادبی سرزد ہوگئی ہو۔ اسے یاد آیا، مومنہ کا صبح کی اولین
 ساعت جیسا ہی پاک اور معصوم سا چہرہ..... غید سوتی دوپٹے میں لپٹا ہوا..... وہ ہمیں اسی
 بیٹھ کے تلاوت کرتی تھی اور سامنے بیٹھا عقیدت سے اسے سنا جاتا۔

اس کے غیر محسوس سی حرکت کرتے گلابی لبوں کو بل بل کے پڑھتے ہوئے
 کا نورانی ڈولتی بالیوں کو
 کتنی بڑے بڑے نکھوں کی لرزیدہ پلکوں کے سائے کو
 سورج کی کرنوں سے ایک اٹھنے والی ٹاک کی لوگ کو...
 پیشانی پہ آویڑاں اس پر ہر سے عکس کو...
 کیوں...؟
 کیوں.....؟

کیوں بھلا دیا میں نے اس نور کو؟ کیوں نہ اس وقت مجھے یہ پاکیزگی یاد آئی
 ..؟ کیسے یقین کر لیا میں نے کہ مومنہ.. مومنہ اور فیروز کیا یہی تھا میرا عشق۔ یہی تھی
 میری محبت.....؟ یہی دعوے کیے تھے میں نے..... اتنی بودی محبت۔ اتنے کھوکھلے
 عہد میں جو خود کو بزاروشن دماغ تعظیم یافتہ، سلجھا ہوا اور پچھور شخص سمجھتا رہا ہمیشہ خود کو
 اس سارے روایتی اور دقیا نوسی سیٹ اپ میں اجنبی تصور کرتا رہا۔ اصل میں کیا نکلا؟ ایک
 جاہل، کم نگاہ، وہی فرسودہ اور روایتی مرد... جو کسی تیسرے شخص کی بے سرد پابا توں پہ بغیر

URDU PHOTO

کسی ٹھوس اور واضح ثبوت کے ہی ایمان لے آتا ہے .. جو غیرت اور انا کے آگے محبت اور اعتبار جیسے جذبوں کے پر نچے اڑا دیتا ہے..... اور..... جو.....“

”خان صیب..... خان صیب“
وہ چٹانیں اور کتنی دیر خود کو کنبھرے میں کھڑا کر کے خود ہی پتھر مارتا رہتا کہ اور نگزیب کی آواز یہ چونک اٹھا۔ اسٹوڈیو سے نکل کے دیکھا تو وہ عجیب وحشت زدہ انداز میں کمرے میں گھوم گھوم کے اسے ڈھونڈ رہا تھا۔
”کیا بات ہے اور نگزیب؟“ اس نے متوجہ کیا۔

”وہ..... خان صیب..... بڑے خان جی .. اپنے باچا جان گزر گئے۔“ وہ دھاڑیں مارنے لگا۔

”لیکن زریاب..... وہ قاتل نہیں ہے۔“ مومنہ نے اس انکشاف کو سن کر خود اور مقدس دونوں کو دم بخود کر دیا۔
حیرت کا ایک برنیا اٹکنجہ تھا جس نے ان دونوں کو بولا کہ وہ کوئی اور سوال کرنے کے قابل بھی نہ رہے۔ سختی سے آنکھیں بند کر کے ایسی مومنہ نے کچھ دیر کسی آواز کا انتظار کیا اور پھر رک رک کے بتانے لگی۔

”ہاں وہ قاتل نہیں ہے لیکن .. صرف قانون کی نظر میں ہی اسے بے قصور ٹھہرایا جاسکتا ہے۔ مجھ سے پوچھو .. مجھ سے پوچھو کہ اس کے ذہن پر کس کس کا ظہور ہے..... مجھ سے حساب مانگو میں بتاتی ہوں اس سے کتنے قتل ہوئے ہیں۔ کتنے جذبے بے موت مارے گئے ہیں، کتنے خواب سولی چڑھے ہیں، کتنی آرزوئیں سسک سسک گئے، فنا ہوئی ہیں اور کتنی محبتوں کا خون ہوا ہے اس شخص کے ہاتھوں میں۔“ اس نے کہا۔
”اس لیے .. صرف اس لیے میں نے ..“ اس نے بار بار اس زبان سے لے کر گئی۔ ”آپ نے پہلے اتنے جھوٹ کیوں بولے۔ وہ ساری جھوٹی کہانی“ خوشنود نے سر سے تختے میں پڑ گیا۔

”نہیں .. میں نے کوئی جھوٹ نہیں بولا۔ میں نے کبھی کوئی جھوٹ نہیں بولا۔ میں جھوٹ بول ہی نہیں سکتی، میں نے پہلے تم سے جو کچھ کہا تھا اس کا حرف حرف سچائی لیے دئے ہے ہاں یہ ضرور ہے کہ میں نے تم سے بہت سی باتیں چھپائی تھیں۔ کچھ پردے پڑے رہنے دیئے تھے۔“ وہ الزام سبب نہ سکی، اپنی صداقت تسلیم کرانے کے لیے جیسے اس میں نئی قوت پیدا ہو گئی۔ اس کی آواز اب پہلے سے بلند تھی اور واضح بھی۔

”میں بھی جھوٹ نہیں بول سکتی۔ جھوٹ بولنے سے بچنے کے لیے ہی تو میں وہاں سے بھاگ نکلی تھی۔ جھوٹ بولنا بھی میرے لیے ناممکن تھا اور سچ..... سچ بتانے سے زریاب کو سزا نہ مل پاتی اور میں اسے سزا سے کیسے بچنے دیتی۔ کیا غیرت اور حمیت صرف مردوں کی میراث ہے۔ کیا اپنی عزت پہ بن آتے دیکھ کے خون کی ندیاں بہانا صرف مردوں کا شیوہ ہے۔ کیا کسی عورت کے اندر بدلے کی آگ نہیں بھڑک سکتی جب اس کی وفا اور عزت پہ وار کیا جائے۔ کیا عورت کے اندر وفا، ممتا اور محبت کے خزانے بھر کے قدرت غیرت اور وقار رکھنا بھول گئی تھی؟ نہیں..... عورت بھی اپنی ذات اور اس کے تقدس کے حوالے سے اتنی ہی غیرت مند ہوتی ہے جتنا کہ ایک مرد اور پھر میرے جیسی عورت..... جس نے عزت کو محبت پر ترجیح دی، جو پہاڑوں نے اپنی گود میں لے کر جسے بچپن لے لے ہی اپنے جیسی سر بلندی اور پستکی عیب کر دی ہو، جو تن تہا جنگلوں میں بسنے والی غیر قوم کے ساتھ سزا شہدے کے ایک عمر بتا چکی ہو۔ میرے لبو میں یہ سرکشی گردش کر رہی تھی، میں خود پر اٹھنے والی نگاہ بھسم کرنے کی قوت رکھتی تھی، خود پہ اٹھنے والی انگلی کیسے سلامت رہنے دیتی۔

تمہارے باپ نے مجھے پہاڑوں کی گود سے نکالا، شہر میں بسایا لیکن وہ میرے اندر کی سر اور غیور، بخارن کو مکمل طور پہ تبدیل نہ کر پایا۔ اس کی محبت نے وقتی طور پر اس کو تیار کر دیا۔ مرنے والی عورت کو سزا ضرور دیا تھا۔ کتنا ہی عرصہ اس کی محبت کے شمار مل سرتار لگے۔ کتنی ہی زندگی گزارتی رہی، اس کی ماں اور اس کی بہن کے طنز یہ اور تذلیل میں ڈوبنے پر مجھ کو تیار نہیں کرتے تھے۔ لیکن بلکی سی دستک دے کے لوٹ جاتے، وہاں کے کبھی کبھی بولوں کا ہوتا تھا۔

اہل کے خاندان کی نفرت امیز اور حقارت آمیز نظریں مجھ تک اٹھتیں لیکن میرے اندر کوئی شعلہ نہ بھڑکتا میری آنکھوں کے آگے تو زریاب کے مسکراتے چہرے اور جذبے لٹائی نظروں کا مست رنگا پردہ پڑا ہوا تھا۔ لیکن جب خود زریاب کے بولوں میں وہی زہر اُترا۔ جب خود اس کی آنکھوں میں میں نے بے اعتباری دیکھی تو کیسے میری مدہوشی نہ ٹوٹتی۔ اس دن .. اس پہلے .. میرے اندر کی وہ پہاڑن پھر سے جاگ اٹھی تھی اور کسی طور نہ بہل رہی تھی۔“ وہ ہانپنے لگی۔ خشک ہوتے لبوں پہ زبان پھیرتے ہوئے اس نے دھندلی آنکھوں سے ان دونوں کو دیکھا چاہا، سائے سے اس کی آنکھوں کے آگے لہرائے اور اس نے دوبارہ آنکھیں موند لیں۔ اس کی ناتوانی نے اس کی تمام حسیات کو اکٹھے مستعد

رہنے کے قابل نہ چھوڑا تھا، سلسل بولتے رہنے سے اس کی بصارت نے اندھیرے اوڑھنے شروع کر دیئے تھے۔ لیکن دماغ جاگ رہا تھا اور اس پہ وہ سارا منظر بہت واضح..... بہت صاف دکھائی دے رہا تھا۔

”زر..... یاب....“ فیروز دھاڑا۔ ”ہوش میں رہ کر بات کرو۔“ اگرچہ وہ اس کی باتوں کے پس منظر سے ناواقف تھا لیکن میرے حوالے سے کہے گئے گھٹیا جملے سن کر اپنا نکل برقرار نہ رکھ پایا۔

”ہوش میں تو میں اب آیا ہوں۔ تم تو شادی شدہ تھے ناں اور وہ بھی دنے دنے کے ساتھ..... تمہاری ایک نہیں دو دو بہنیں تمہارے سسرال بیابھی گئی تھیں اس لیے خود شادی کر کے اپنے لیے مسائل کھڑے کرنے کے بجائے تم نے زیادہ محفوظ رہ کر اپنا کیا..... وہ عورت اسے تو دولت اور مقام ہی چاہیے تھا پھر وہ عورتوں کے ساتھ ملتا تو کیا برا ہوتا“ میں کہتا ہوں خاموش ہو جاؤ زریاب تمہارے ہوش میں نہیں.....“

غمیے کی شدت سے اس کی آواز کانپ رہی تھی لیکن زریاب واقعی ہوش میں نہیں تھا۔ اس کے دل و دماغ پہ اس وقت زہر چڑھا ہوا تھا۔ وہ بول رہا تھا۔ ”تم نے چند ہی منٹوں میں سارا کھیل سچ لیا، ایل سوچے مجھے منہ دے کے تخت مجھ سے اس کی شادی کرواتے ہوئے اپنا حصہ واضح رکھا اور یہ کرتے ہوئے تم نے پاک رشتوں کو استمال کرنے سے بھی گریز نہ کیا۔ اپنی پوزیشن صاف رکھنے کے لیے اور موسم سے تعلق جوڑے رکھنے کے لیے تم نے اسے بہن کہہ کر مجھے دھوکا دینا چاہا۔“

”بس..... بس کرو اپنی یہ بکواس ورنہ میں بھول جاؤں گا کہ تمہارا بیٹا کیا رشتہ ہے۔“

”تمہارا اور میرا کوئی رشتہ نہیں۔ تمہارے اور میرے بیچ صرف ایک عورت ہے۔“

یہ راز کھل چکا ہے اب کچھ باقی نہ بچے گا نہ تم نہ وہ۔ نہ تم دونوں کا مکروہ اور گھٹیا تعلق۔“

”گھٹیا تم خود ہو اور مکروہ تمہاری ہونچ ہے۔“

”اور تم دونوں تو بہت باغلی اور ارفع ہو۔ وہ بد کردار عورت شوہر کی غیر موجودگی چند دن بھی نہ برداشت کر سکی اور اپنے مرد کے گھر میں ہی، اسی کی چھت کے نیچے اپنا یار بلوا کے عشق کے تماشے کرتی رہی اور جب بھانڈا پھونکا تو گھر اور اولاد کو چھوڑ کے اسی کے ساتھ چل پڑی۔“

اس کے تفصیلی الزام پہ میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا خود فیروز لالہ بھی

لڑکھڑاسا گیا۔

”یہ سب بکواس کس نے کی تم سے؟ تم نہیں جانتے ہو وہ میرے ساتھ کسی طرح اور کس حال میں آئی ہے۔ یہ ٹھیک ہے اسی نے مجھے بلوایا تھا مگر.....“ زریاب نے پوری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی اس پہ دوبارہ بندوق تان لی۔

”میری ماں نے خود تم دونوں کو دیکھا تھا عزت اور شرم کی دھجیاں بکھیرتے ہوئے اور میرے لیے اس سے معتبر گواہی اور کوئی نہیں۔“ اچانک فیروز لالہ اس پہ پل پڑا۔ وہ اس سے بندوق چھیننے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کا خون بھی جوش میں آ گیا تھا۔

”اگر تم میری بہن کے شوہر نہ ہوتے تو میں تمہارا خون بہا دیتا۔“ اس نے بندوق کا رخ اپنی طرف موڑتے ہوئے کہا۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے غمگن گھٹتا تھے اور میں اسی طرح بیٹھتی تھی کہ جسم یہ تکلیف دہ تماشہ دیکھ رہی تھی۔ میں چنا کے لالہ سے کہنا چاہتی تھی۔ ”بھادو اس کا نہیں۔“ مت پروا کرو لیہ تمہاری بہن کا شوہر ہے..... یہ میرا شوہر نہیں ہے یہ..... یہ تو جانور ہے..... جانور..... جس کا شعور فنا ہو چکا ہے۔ جس کے اندر سے ہر جذبہ مٹ چکا ہے اس لیے یہ سر سے پیر تک جانور ہے غلیظ وحشی اور درندہ جانور.....“

اور کوئی نہ میرا شہر نہیں بھولتا۔“

لیکن میں چاہتا تھا کہ میں سکتے کے عالم میں تھی۔ ایک ایسا سکتہ جو صرف جسم پر قابض ہوتا ہے، روح کو سبب بننے کے لیے آزاد چھوڑ دیتا ہے۔ میں سب دیکھ رہی تھی سب لہسن رہی تھی، صرف کچھ کہنے کی قابل نہ رہی تھی۔ کاش..... کاش یہ سکتہ مجھے مکمل طور پہ جتن دیتا..... میں دیکھ کر دیکھ کر نہ پاتی..... کچھ سن بھی نہ پاتی۔

”اب تو اپنی گندی زبان سے ان گندے تعلقات کو اس پاک رشتے کا نام نہ دو۔ وہ عورت تمہاری کیا کسی کی بہن بھی بننے کے قابل نہیں..... وہ کسی کی بیوی بننے کے قابل نہیں۔“

”زریاب سلسل اپنے زہریلے خیالات سے اسے اور بھڑکار رہا تھا۔ فیروز لالہ نے اس کی بندوق چھین کے اسے اور مشتعل کر دیا تھا۔ اب وہ ہاتھوں اور پیروں کی مدد سے اس پہ وار کر رہا تھا۔ اس نے اچانک بندوق اپنی طرف کھینچی شروع کر دی۔ اسی کھینچا تانی میں لالہ کی نظر دروازے پہ پڑی مجھے دہلیز پہ گرے دیکھ کے اس کی حرکت بس ایک لمحے کے لیے تھمی تھی۔ اس کے چہرے کی سرخ رنگت یکدم زرد پڑ گئی، میں نے ان آنکھوں میں ٹکست..... اور شرمساری کے سائے لہراتے دیکھے۔ شاید اسے اپنے وہ سارے دعوے یاد آئے تھے جو اس نے مجھے اس شادی پہ رضامند کرتے ہوئے کیے تھے یا پھر شاید بہن کے

سامنے ہی اپنے رشتے کی پامالی نے اسے پاتال میں گرا دیا تھا۔

اسے کمزور پڑتا دیکھ کے زریاب نے بندوق کی نالی کا رخ اس کی گردن کی طرف کر دیا۔ میرادل اُٹھل کے حلق میں آ گیا میں نے بے اختیار لالہ کے ڈھیلے ہوتے ہاتھوں کو بندوق پہ نیچے کی طرف پھسلتے ہوئے دیکھا، عجیب حسرت زدہ انداز میں مجھے دیکھ کے اس نے فائر کر دیا..... اور..... اور میرادل حلق سے پھسل کر کہیں نیچے... بہت نیچے گر گیا۔ میں جان گئی اس نے یہ فائر کیوں کیا تھا..... غیرت کا ایک رنگ یہ بھی تو ہے..... زریاب نے اس کی پاکیزگی پہ کچھرا اچھالا تھا ایک بھائی کو گالی دی تھی..... وہ میرے سامنے ہی اتنی بڑی گالی سہہ نہ پایا، شرم نے اسے اپنی جان لینے پہ مجبور کر دیا۔ فائر کی آواز سن کے ملازم اندر چلے آئے۔ لالہ خون میں لت پت نیچے پڑا تھا۔ موت نے اپنے ایک پل میں ڈھانپ لیا تھا۔ لوگوں نے بندوق پکڑنے زریاب کو ہر طرف سے جھڑ لیا وہ ابھی بھی اسی کیفیت میں تھا۔

”چھوڑو مجھے..... میں کہتا ہوں چھوڑو مجھے۔“

”تم نے ہمارے صیب کو مار دیا۔ مارو اسے۔“ ہر طرف چیخ و پکار مچی تھی۔ کئی ملازم روتے چلاتے مردان خانے کے اندر دنی جیسے ہر طرف روڑے مار رہے تھے۔

”ہاں میں نے مارا ہے اسے۔ میں خود گولہ مارا ہے اسے۔“

مارنا کوئی شرم کی بات نہیں جو میں چھپاؤں گا۔

”میں بزدل نہیں ہوں، میں کہیں نہیں بھاگتا، مجھے چھوڑ دو ابھی ایک حساب باقی ہے ابھی مجھے اس کی جان بھی لینی ہے۔“

میرے اندر جیسے ایک زور کا پتھر آن گرا اور پھر سے میرے دل پر جان بڑھ گئی۔ میں نے سن ہوتے پیروں پہ کھڑے ہونے کی کوشش کی۔ زریاب کے الفاظ سن کر مجھے لگتا تھا کہ میں راہ بھائی۔ وہ اتنے طیش کے عالم میں تھا کہ یہ بھی محسوس نہ کر سکا، اس کے دونوں ہاتھ تو بندوق کی نالی پہ تھے۔ اس نے لالہ کے ہاتھوں کی حرکت دیکھی ہی نہیں۔ وہ یہی سمجھ رہا تھا کہ یہ تل اس نے کیا ہے اور اندر آئے ہوئے ملازمین بھی یہی سمجھ رہے تھے۔ دیکھا جائے تو ایک طرف سے یہ سچ بھی تھا لیکن میری نظر سے کون دیکھتا؟ میں نے نظر و عقل کے اس دھوکے کو برقرار رکھنے کا فیصلہ کیا۔ حقیقت کیا تھی، یہ صرف میں اور لالہ جانتے تھے یا پھر خدا۔ فیروز لالہ کچھ کہنے کے قابل نہ رہا تھا اس کی شرم نے اسے منوں مٹی تلے منہ چھپانے پہ مجبور کر دیا تھا اور میں..... میں حقیقت کسی کو نہیں بتاؤں گی یہ میں نے طے کر لیا اور خدا تو ہے

ہی سب سے بڑا منصف..... یقیناً یہ سب فیصلے مجھ سے وہی کروا رہا تھا۔

میں نے بیٹی میں پڑی چادر اٹھائی اور وہاں سے نکل بھاگی اب تک کسی کی نظر مجھ پہ نہیں پڑی تھی۔ کوارٹروں کے پچھلی طرف تندور کے پاس سے گزرتے ہوئے حواس باختہ سی لالٹی کو میں نے موہیے کی بازو پھلانگتے ہوئے دیکھا۔ وہ کبھی مردان خانے کے اس بیدنی حصے کی طرف نہیں گئی تھی لیکن حویلی میں بچے شور نے اسے ایسا کرنے پہ مجبور کر دیا تھا۔ ”لالٹی..... لالٹی بہن.....“ قالے کے گھنے پودوں کے بیچ چھپ کے میں نے اسے آہستہ آہستہ آوازیں دیں۔ وہ چونک پڑی، بڑی سی کالی چادر ذرا سی سرکا کے اس نے اپنی وحشت زدہ نگاہیں ادھر ادھر دوڑائیں۔

”مومنہ..... تم اور.....“ میں اس کا ہاتھ تھام کے گندم اور اناج والی کوٹھری میں لے آئی۔ اس کی سر اسیدہ حالت صاف بتا رہی تھی کہ فائر کی آواز اور ملازمین کے رونے پینے نے اس کی آواز کو خدشات کو جگا دیا تھا۔ وہ اپنی بڑی بڑی آنکھیں آنسوؤں سے بھری مجھ سے سوال کر رہی تھی۔

”کیا ہوا مومنہ؟ تمہارا لالہ وہ تو اور اندر تھا..... کہاں ہے تمہارا لالہ..... وہ ٹھیک ہے نا؟“

”میں نے اس کی بھری بھری کلاسیاں، سرے سے بھری آنکھیں اور دندا سے سر شلب دیکھے۔ میری بہن نہ پڑی کہ میں اپنی زبان سے اسے سہاگن سے بیوہ ہونے کی منگوس خبر سناؤں۔“

”مجھ سے کچھ نہیں پوچھو لالٹی۔ میرے پاس وقت نہیں ہے۔ مجھے ابھی اسی وقت بیتاں سے چاہئے اور مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔“ میں نے اپنے ننگے پیر اور خالی ہاتھ دکھاتے ہوئے کہا۔

”یہ مت سمجھنا میں اپنی جان بچا کے بھاگ رہی ہوں، وقت ملا تو ضرور تمہیں ساری بات بتاؤں گی فی الحال تو تم سے اپنے اور فیروز لالہ کے رشتے کے صدقے کچھ مانگ رہی ہوں۔“ وہ بڑی الجھن کا شکار تھی، کبھی میری بات سننے کی کوشش کرتی کبھی مڑ کے حجرے کے اس کمرے کو دیکھتی جہاں اتنے فاصلے سے بھی بیجوم بڑھتا دکھائی دے رہا تھا، اس کا سارا دھیان اسی طرف تھا۔ میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے ہاتھ سے طلائی کنگن اتارنے کی کوشش کی۔

”یہ کیا کر رہی ہو؟“ وہ اور ہراساں ہو گئی۔

”لالٹی۔“ میں نے آنسو پیتے ہوئے کہا۔

”میں نے کہا ناں بہن میں ایک انجانے سفر پر جا رہی ہوں مجھے زور راہ چاہیے۔ خدا

کاوا۔ بلکہ ہے میری مدد کرو تمہیں لالہ کی قسم، اس نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی کلنگن اتارے۔ چادر کے پلو سے بندھے چند دس دس کے نوٹ نکالے، چپل اتار کے میرے آگے کی اور میرے گلے لگ کے اونچی اونچی آواز میں رونے لگی، شاید اس کے اندر کسی نے اسے اجڑنے کا اشارہ دے دیا تھا۔ دوبارہ اس نے مجھ سے لالہ کے بارے میں کچھ نہ پوچھا۔ میں نے اس سے راز داری کا وعدہ لیا اور وہاں سے فرار ہو گئی۔

اس وقت سارے علاقے کی توجہ حویلی پہ ہونے والے واقعے کی طرف تھی۔ میں بڑی آسانی سے سیدو شریف سے نکل گئی۔ پشاور جانے کے بجائے میں نے پنڈی کا رخ کیا۔ وہاں زریاب کا خطرہ کم تھا۔ پھر..... پھر میں نے نجانے کیا سوچ کے لاہور کا ٹکڑا لے لیا۔ میں اس وقت بالکل اکیلی تھی۔ تنہا لاہور پہنچا، میرا کوئی نہ تھا۔ نہ پوچھتا، نہ پوچھتی تھی۔ پیر کے نیچے زمین اپنی تھی۔ ایسے میں لاہور جانا میں نے مناجات کی تھی، شاید وہاں کی کسی مجھے اپنی ہی لگے۔ کہتے ہیں ہر انسان کی نسل باپ سے بنتی ہے، باپ کا حوالہ اس کی پہچان ہوتا ہے، میرا باپ یہیں کا تھا، اسی شہر میں میں میرے خون کے رشتے موجود تھے۔ بھلے وہ مجھے نہیں جانتے تھے، میں انہیں نہیں پہچانتی تھی لیکن وہ تھے تو سہی، اس شہر نے مجھے

پناہ دی۔ لالہ کا دیا، واز یور کچھ دن میرے کام آیا۔ وہاں سے لاہور آئی اور اس نے مجھے پناہ بھی لیکن پھر زندہ رہنے کے لیے مجھے نوکری کرنا پڑی۔

دن ایسے ہی گزر جاتے اگر موت مجھے خوفزدہ نہ کر دیتی۔ مجھے مرنے سے ڈر نہیں لگتا تھا، مجھے لاوارث مرنے سے ڈر لگتا تھا۔ میں نے کوئی کچھ پھر سے صدا دی۔ میں چاہتی تھی کوئی اپنا بڑی محبت سے مجھ پہ مٹی ڈالے، بڑے دل سے میری مغفرت کی دعا کرے، اور قدرت نے مجھے میرے دوا اپنے ملا دیے۔ میرے لالہ کی آخری نشان اپنی میری بیٹی میری بیٹی جو مجھ سے اتنی متنفر ہے کہ..... لیکن اس کا کیا تصور میں کر سکتی تھی۔ لیکن ماں ہونے کا فرض ادا نہیں کیا تھا۔ ایسا نہیں تھا مقدس کہ میں قبول گئی تھی۔ تمہیں..... لیکن میری بات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ ”وہ اس بھرے انداز میں سر جھکائے چپ چاپ بیٹھی مقدس کو دیکھنے لگی۔

”میں اس واقعے کی معنی شاہد تھی۔ اگر کسی کو یہ پتا چل جاتا تو لازماً مجھے عدالتوں میں نمینا جاتا اور مجھے خدشہ تھا کہ کٹہرے میں کھڑے زریاب کو دیکھ کے میں کمزور نہ پڑ جاؤں۔ میں نے کہا تھا نا تم سے کہ میں اپنے اندر کی محبت کی ماری عورت سے ذرہ لی ہوں۔ مجھے لگ رہا تھا تمہیں دیکھ کے میرے قدم نہ لڑکھڑ جائیں۔ شاید تمہارے سر سے

باپ کا سایہ کھینچنے کی ہمت نہ ہو سکے۔ شاید زریاب کے چہرے پہ پھیلا پچھتاوا مجھے نرم کر دے۔ مجھتیں کمزور بنا دیتی ہیں، سمجھوتا کرنا سکھاتی ہیں۔ عشق عیب ڈھک دیتا ہے، میں نہ کمزور پڑنا چاہتی تھی نہ نرم ہونا۔ مجھے سمجھوتا نہیں کرنا تھا، بدلہ لینا تھا میں نے محبت مار دی اور نفرت زندہ رہنے دی۔ میرے کانوں میں اس کے الفاظ کی بازگشت سنائی دیتی، میری انا کو کچھ کے لگتے۔

میرے رخسار کا داغ لودینے لگتا اور دل میں پھر سے تپش بھڑک جاتی۔ اس کی گالیوں کے چھینٹے نظر آتے تو میری روح انتقام سے لہکتی جاتی۔ میں چاہتی تو عدالت میں اپنے داغ دکھا کے اور ساری سچائی بیان کر کے اسے پشیمانی میں مبتلا کر سکتی تھی۔ سچائی کے آگے بی بی جان کے بودے الزام کتنی دیر قائم رہتے ہیں اس سے کیا ہوتا، اس کے کہے الفاظ تو واپس نہ لوٹ جاتے، بے اعتباری کا داغ تو نہ مٹ سکتا۔ بے عزتی کا دکھ میری رگ رگ میں اتر چکا تھا۔ اب میری یادداشت ہی ساتھ چھوڑ دیتی تو میں کیسے بھلا سکتی تھی۔ لیکن میں کچھ نہ بھولی..... صرف اپنا عورت ہونا بھول گئی، بیوی ہونا، ماں ہونا بھول گئی، صرف زریاب کو سزا دینا یاد رہا۔

میں بھاگ گئی۔ مجھے کچھ گناہی تھا اگر موجود رہتی تو سچ بیان کرنا پڑتا اور شاید تب اسے اپنی گناہ کا احساس ہو جاتا۔ وہ معافی مانگتا، پچھتاوا، روتا تو شاید..... مجھے اسے معاف بھی کرنا پڑ جاتا اور میں نے اسے مطمئن کر دیتی۔ زریاب کو اطمینان مل جائے کیا یہی انسان ہے؟ اس سے عم بچتا دیکھنا چاہتی تھی چاہے اس کے لیے مجھے خود کو شعلوں پہ ہی

کہوں نہ جانا پڑتا۔ ”مقدس خود کو؟“ مقدس کے سوال پہ اس نے گہری سانس بھری۔ ”میں مانتی ہوں میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی اپنے ساتھ ساتھ تمہیں بھی ایک ساتھ ساتھ میں ڈالا۔ لیکن میں پہلے بتا چکی ہوں کہ تمہیں تمہارے خاندان میں تمہارے اپنے لوگوں میں چھوڑتے ہوئے مجھے وہ نکر نہ تھی۔ اب میں کہاں جانتی تھی میرے انیسب کا ہتھ حصہ تم بھی جبراً لوگی۔ اجنبیت تمہاری پہلی بھی بنے گی اگر مجھے پتا ہوتا تو میں تمہیں بھی اکیلا نہ چھوڑتی لیکن اتنی دیر تک تو میں نے سوچا ہی نہیں۔ میرے دل وہاں پہ تو اس وقت ایک ہی دھن سوات تھی۔

اب احساس ہو رہا ہے کہ اگر واقعی طور پہ زریاب کے پچھتاوے کے قابو میں نہ رہے تھے تو میں کب پورے ہوش و حواس میں رہی تھی۔ مقدس! میں اس کی تلافی کرنا چاہتی ہوں۔ میرا یہ اعتراف اس کا پہلا قدم ہے اور خوشنود تم اب جان گئے ہو گے کہ زریاب

تمہارے باپ کا قاتل نہیں ہے۔ اس نے خود اپنی جان لی تھی، حالات چاہے کیسے ہی رہے ہوں، ان کا ذمہ دار چاہے کوئی بھی ہو، بہر حال اسے خود کشی ہی کہیں گے۔“

”آج آپ یہ کہہ رہی ہیں اور کیوں کہہ رہی ہیں، میں جان گیا ہوں۔“ اس نے کن انکھیوں سے مقدس کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”لیکن پھوپھو جان، میں تو آپ کی نظروں سے دیکھ رہا ہوں اور آپ نے ہی کہا تھا کہ میری نظر سے دیکھو وہ کتنے لوگوں کا قاتل ہے۔“

”اسے اس کی سزا بھی تو مل رہی ہے، قید میں بھی اور قید سے باہر بھی ایک مسلسل سزا اس کے تعاقب میں ہے ایک پچھتاؤوں سے بھری اجڑی ہوئی زندگی اس کا انتظار کر رہی ہے۔ تم اس کی باقی سزائیں قدرت کے لیے چھوڑ دو اور اپنے دل کو بصورتِ دل کو صاف

شفاف کر لو بالکل اپنے باپ کی طرح، بنا کسی نفرت کے، بنا کسی کینہ کے۔“

”میں کسی سے نفرت نہیں کرتا۔“ اس نے اٹھنے کے لیے اٹھنا شروع کیا۔ اس نے مقدس کو دیکھا اور اپنی شکست کا اظہار کیا۔

”لیکن محبت.... اس کے لیے ابھی دل اتنا صاف نہیں ہوا کہ...“

مومنہ نے اس کی بات کاٹ دی۔

”تم مقدس کو بھی میری نظر سے دیکھو۔ میری نظر سے دیکھو تو وہ دوبارہ دل لائی ہے، یہ بھول جاؤ گے۔“ اس نے خوشنود کا منہ بولا ہوا ہاتھ دباتے ہوئے اصرار کیا۔ اس کے

کہنے پہ اس نے نظر اٹھائی۔ کمرے کے اس گوشے میں موجود مقدس شیشے سے پرے تاریک میدان کو دیکھ رہی تھی۔ رات کے سائے گہرے ہو چکے تھے اور باہر موجود سنبھلے لان میں جلتے اکا دکا بلب کے ٹنٹناتے ٹکس شیشے پہ نمایاں ہو رہے تھے۔ ان جگہ پر

سایوں کے ساتھ مقدس کا چہرہ آج بھی اسے اتنا ہی روشن اتنا ہی منور لگ رہا تھا جتنا کہ

اول محسوس ہوا تھا۔ اس کی خلا میں بھٹکتی آنکھوں کے نیلگوں آئینے رات کے اس سے سیاہی مائل سے لگ رہے تھے اور مومی انگلیاں بے دھیانی میں دیوار پہ نجانے کیا لکھ رہی تھیں۔ وہ اسے دیکھتا رہا۔ دھند چھشتی رہی۔ وہ اسے دیکھتا رہا اور گرد صاف ہوتی رہی.... وہ اسے دیکھتا رہا اور روئشیاں دل میں اترتی گئیں۔

”میرا دل... ہاں میرا دل شفاف ہے۔“ اسے احساس ہوا تو اعتراف کرنے لگا، مومنہ کی آنکھ لگ چکی تھی۔ دواؤں کے زیر اثر اس کے اعصاب اس کے کنٹرول سے باہر تھے۔ یہ محض اس کی اپنی قوتِ ارادی تھی جو وہ نہ صرف اتنی اتنی دیر عالم ہوش میں رہ جاتی

تھی۔ یہ محض اس کی اپنی قوتِ ارادی تھی جو وہ نہ صرف اتنی اتنی دیر عالم ہوش میں رہ جاتی

تھی۔ یہ محض اس کی اپنی قوتِ ارادی تھی جو وہ نہ صرف اتنی اتنی دیر عالم ہوش میں رہ جاتی

تھی بلکہ یادداشت کی زنجیل سے برسوں پرانے واقعات بھی ڈھونڈ لاتی تھی۔ اس نے کبھی درست کر کے اوڑھایا اور چپکے سے مقدس کے پیچھے جا کھڑا ہوا۔ دیوار پہ حرکت کرتی اس کی انگلیوں پہ غور کیا وہ بے دھیانی میں ماں لکھتی چلی جا رہی تھیں۔

”ماں.....!“ اس نے سرگوشی کی تو وہ چونک کے سڑی۔ خوشنود نے اسے انگلیاں مسل کے مٹھی بچھتے ہوئے دیکھا۔

”سزائیں دینے کا یہ عمل کب تک جاری رہے گا مقدس، کیا سزا اور سزا ہمارے نصیبوں میں لکھی دی گئی ہے۔ کسی نے اپنی محرومیوں کی سزا ایک گلاب چہرہ چھلکا کے دی۔ کسی نے اپنی عزت پہ حرف آتے دیکھ کے ایک باوفا شخص کو اذیت ناک موت کی سزا دی،

کسی نے انتقام کے جذبے سے مغلوب ہو کر ایک جذباتی شخص کو اس کے جرم سے بڑھ کر سزا دی اور تم.... تم مقدس اس ماں کو کیوں سزا دے رہی ہو اسے ماں نہ تسلیم کر کے۔ جاتی ہو وہ زندہ ہی شاید صرف اس لیے ہے کہ تم ایک بار تمام شکوے بھلا کے ان کے گلے لگ جاؤ ورنہ ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے مجھے ان کی حالت دیکھتے ہوئے زندہ رہنے کی اور کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔

مومنہ نے اس کی بات کاٹ دی۔

”تم مقدس کو بھی میری نظر سے دیکھو۔ میری نظر سے دیکھو تو وہ دوبارہ دل لائی ہے، یہ بھول جاؤ گے۔“ اس نے خوشنود کا منہ بولا ہوا ہاتھ دباتے ہوئے اصرار کیا۔ اس کے

کہنے پہ اس نے نظر اٹھائی۔ کمرے کے اس گوشے میں موجود مقدس شیشے سے پرے تاریک میدان کو دیکھ رہی تھی۔ رات کے سائے گہرے ہو چکے تھے اور باہر موجود سنبھلے لان میں جلتے اکا دکا بلب کے ٹنٹناتے ٹکس شیشے پہ نمایاں ہو رہے تھے۔ ان جگہ پر

سایوں کے ساتھ مقدس کا چہرہ آج بھی اسے اتنا ہی روشن اتنا ہی منور لگ رہا تھا جتنا کہ

اول محسوس ہوا تھا۔ اس کی خلا میں بھٹکتی آنکھوں کے نیلگوں آئینے رات کے اس سے سیاہی مائل سے لگ رہے تھے اور مومی انگلیاں بے دھیانی میں دیوار پہ نجانے کیا لکھ رہی تھیں۔ وہ اسے دیکھتا رہا۔ دھند چھشتی رہی۔ وہ اسے دیکھتا رہا اور گرد صاف ہوتی رہی.... وہ اسے دیکھتا رہا اور روئشیاں دل میں اترتی گئیں۔

”میرا دل... ہاں میرا دل شفاف ہے۔“ اسے احساس ہوا تو اعتراف کرنے لگا، مومنہ کی آنکھ لگ چکی تھی۔ دواؤں کے زیر اثر اس کے اعصاب اس کے کنٹرول سے باہر تھے۔ یہ محض اس کی اپنی قوتِ ارادی تھی جو وہ نہ صرف اتنی اتنی دیر عالم ہوش میں رہ جاتی

تھی۔ یہ محض اس کی اپنی قوتِ ارادی تھی جو وہ نہ صرف اتنی اتنی دیر عالم ہوش میں رہ جاتی

تھی۔ یہ محض اس کی اپنی قوتِ ارادی تھی جو وہ نہ صرف اتنی اتنی دیر عالم ہوش میں رہ جاتی

تھی۔ یہ محض اس کی اپنی قوتِ ارادی تھی جو وہ نہ صرف اتنی اتنی دیر عالم ہوش میں رہ جاتی

تھی۔ یہ محض اس کی اپنی قوتِ ارادی تھی جو وہ نہ صرف اتنی اتنی دیر عالم ہوش میں رہ جاتی

”اور شناور؟“

”اس کے ہاسٹل بھی فون کیا ہے وہ اس وقت وہاں موجود نہیں“

”اتنی صبح صبح تو کالج بھی نہیں کھلتا وہ کہاں چلی گئی۔“ اس سوال کا جواب تو دراب کے پاس بھی نہیں تھا۔ رات کے پہلے پہر باچا جان کی وفات ہوئی تھی، اس وقت انہوں نے گریٹر ہاسٹل فون کرنا مناسب نہ سمجھا تھا۔ رات سے ہی برادری کے لوگوں کی آمد شروع ہو گئی تھی۔ ڈاکٹروں کے مطابق باچا جان کو زیادہ دیر تک رکھا بھی نہیں جاسکتا تھا۔ اور صبح فجر سے لے کر اب تک وہ لاہور میں مقدس اور شناور سے رابطہ کرنے میں ناکام رہے تھے۔ آخر کار افراسیاب خٹک نے فیصلہ سنا دیا۔

”رابطہ کی کوشش جاری رکھو۔ انہیں آج ہی اطلاع ملنا تو لازمی ہے البتہ انتظار میں باچا جان..... میرا مطلب ہے اب ان کی روانگی کا انتظام کیا جانا چاہیے۔“

ذریاب اور بی بی جان دونوں صدمے سے نڈھال اس حوالے سے بے خبر تھے۔ بیس سال کی قید میں ایک ساکت و جامد زندگی گزارنے کے بعد ذریاب کے لیے رہائی کے فوراً بعد ملنے والے بے درپے جھکے شدید تباہی ہوئے تھے اس کا دھیان ہی اس طرف نہیں کیا البتہ تجہیز و تکفین کے بعد بی بی جان ذرا تھک کر رہ گئیں۔

”کسی نے لاہور اطلاع نہیں بھجوائی بچیوں کو؟“

ذریاب بھی چونکا اور دراب کے تفصیلی جواب نے دونوں کو نئی نگر میں ڈال دیا۔

”کہاں جاسکتی ہے مقدس دو چار دن کے لیے لے لیا جاسکتا تو کبھی نہیں: وا اور شناور وہ تو کالج سے چار بجے تک آجاتی ہے میں عموماً اسی وقت اسے فون کرنا کرتی ہوں پھر اب شام کے سات بجنے والے ہیں اور وہ ابھی غائب ہے۔“ بی بی جان بڑبڑا رہی تھیں۔

”اور کالج بھی نہیں گئی ہے وہ آج۔ یہ بھی پتا چلا ہے۔“ دراب نے کہا۔

”کہاں جاسکتی ہیں دونوں بغیر بتائے۔“ وہ کہہ رہی تھیں۔

ذریاب منظر ساہو کے ٹہلنے لگا۔ بڑی دیر سے ہاتھ مسل کے کچھو کہنے کی ہمت جمع کرتی ہوئی زبیدہ بیگم فیصلہ کن انداز میں انہیں۔

”وہ دراصل میرے پاس، میرے پاس شانوکا موبائل نمبر ہے۔“

”موبائل نمبر؟ اس نے موبائل فون کب سے رکھنا شروع کر دیا۔“ دراب نے ماتھے پہ بل ڈال کے پوچھا۔ اس کی اپنی ایک مخصوص سوچ تھی جس پہ بیرون ملک کی تعلیم اور طویل قیام بھی اثر نہ ڈال سکتا تھا اور حقیقت میں شناور اپنے اس چھوٹے ماموں سے خائف ہو کے ہی موبائل فون سب سے چھپا کے رکھنے پہ مجبور ہوئی تھی کہ یہ اس کی ضرورت تھی۔

”اوہ وہ وقت اس بحث کا نہیں۔ تم جلدی سے اسے کال کرو۔“ افراسیاب نے معاملہ ختم کیا۔

بال کمرے میں بچھی چاندنیوں پہ، کافور اور اگر بتیوں کی مہک کے ساتھ وہ تمام لوگ اس وقت تکنگلی باندھے فون پہ بات کرنی زبیدہ کو دیکھ رہے تھے۔

”اس وقت اطلاع کر تو دیتے لیکن تم دونوں اپنے اپنے ہاسٹل میں تھیں ہی کب؟“

شناور نے باچا جان کی وفات کی خبر سنتے ہی جو سوال کیا تھا، وہ اس کا جواب دے رہی تھیں۔ ”اچھا بیٹا صبر کرو، دعا کرو اپنے باچا جان کے لیے، اس طرح رونے سے وہ واپس تو نہ لوٹ آئیں گے۔ شاباش چپ ہو جاؤ اور مقدس کا بتاؤ وہ کہاں ہے..... کیوں غائب

ہوئے۔“ اس وقت سے ہاسٹل سے اس کی غیر گمانگری کا سن کے سب ہی فکر مند ہیں۔“ اسے

خبر کر کے انہوں نے پوچھا اور جواب میں جانے اس نے کیا کہا تھا کہ وہ حیرت کی زیادتی سے اسے اسٹیشن سے اچھل کے کھڑی ہو گئیں۔

”کیا کہا تم نے.....؟“

”کب؟ کسے؟“

”کہاں؟“

”میرا مطلب ہے اب ان کی روانگی کا انتظام کیا جانا چاہیے۔“

ذریاب اور بی بی جان دونوں صدمے سے نڈھال اس حوالے سے بے خبر تھے۔ بیس سال کی قید میں ایک ساکت و جامد زندگی گزارنے کے بعد ذریاب کے لیے رہائی کے فوراً بعد ملنے والے بے درپے جھکے شدید تباہی ہوئے تھے اس کا دھیان ہی اس طرف نہیں کیا البتہ تجہیز و تکفین کے بعد بی بی جان ذرا تھک کر رہ گئیں۔

”کسی نے لاہور اطلاع نہیں بھجوائی بچیوں کو؟“

ذریاب بھی چونکا اور دراب کے تفصیلی جواب نے دونوں کو نئی نگر میں ڈال دیا۔

”کہاں جاسکتی ہے مقدس دو چار دن کے لیے لے لیا جاسکتا تو کبھی نہیں: وا اور شناور وہ تو کالج سے چار بجے تک آجاتی ہے میں عموماً اسی وقت اسے فون کرنا کرتی ہوں پھر اب شام کے سات بجنے والے ہیں اور وہ ابھی غائب ہے۔“ بی بی جان بڑبڑا رہی تھیں۔

”اور کالج بھی نہیں گئی ہے وہ آج۔ یہ بھی پتا چلا ہے۔“ دراب نے کہا۔

”کہاں جاسکتی ہیں دونوں بغیر بتائے۔“ وہ کہہ رہی تھیں۔

”لیکن بی بی جان میں کیسے؟“ اس نے گھر کے انفرادی ماحول پہ اک نظر ڈالی۔ ”ابھی صبح باچا جان کی تدفین ہوئی ہے، گھر لوگوں سے بھرا پڑا ہے، کل ان کے قتل ہیں اور میں یہاں سے چلا جاؤں“

”جانے والے تو چلے گئے زریاب۔“ افراسیاب نے اس کے شانے پہ ہاتھ رکھا۔ ”جو جا رہے ہیں انہیں روک لو۔ اسے تمہاری زیادہ ضرورت ہے۔ سوچنے میں وقت ضائع مت کرو اور جانے کی تیاری کرو۔“

☆ ☆ ☆

نئے بندے مینوں چمکاں مارے

تے میرے روندے نیں نین نمائے

جنیاں تن میرے لگے آئے لکھیاں

تینوں اک لگے آئے تولاں چلائے

غلام فریدا دل آویختے دئے

جتے اگلا قدر وکی جانے

(جتنی میرے تن پہ لگی ہیں تمہیں ایک بھی لگے پھلے۔ غلام فرید دل سے دینا چاہیے جو اس کی قدر بھی جانے)

نیم بے ہوشی کے عالم میں اسے اپنے ابا کی درد مندی ڈوبی آواز سنائی دی۔

یہ گیت یہ گیت ابانے کتنی بار اسے سنایا تھا! بغیر مطلب جانے سمجھے، خود بھی درد کے اک گہرے سمندر میں بہنے لگتی تھی پھر کتنے دنوں بعد جب زریاب سے اس گیت کا مطلب سمجھا تب بھی دکھ کی ہلکی ہلکی سی کہرنے اسے ڈھانپنا چاہا لیکن اس نے جھٹک کے اس دکھ بھرے احساس کو پرے کر دیا ان دنوں تو وہ صرف خوش رہنا چاہتی تھی اور بچھڑاؤ کبر نے اس کے گرد اپنا جال بنا شروع کر دیا، اسے ہر طرف سے غم کی دھند میں لپیٹ دیا

تب اس گیت کے بولوں نے نئے نئے راز کھولے۔ آج ابا کی آواز اسے اوپری اوپری سی نہ لگ رہی تھی۔ آج اس کا ہر لفظ اس کے دل میں اتر رہا تھا۔

”ابا!“ اس کے لبوں سے کراہ سی نکلی اور پھر سے ذہن بے ہوشی کی وادیوں میں کھینچا گیا۔

اے میرے محبوب!

میری آنکھیں تمہاری راہ دیکھ رہی ہیں۔

لوٹ آؤ۔

میں تمہاری تمکون اپنے ہاتھوں میں سمولوں۔

ماں کی آواز میں ”برہ“ اسے سنائی دیا۔ ”ماں..... ماں!“ اس نے ذہن کے گٹھا ٹوپ اندھیرے میں ہاتھ مارتے ہوئے ماں کو تلاش کرنا چاہا۔ اس کی ”کوٹھسی“ پہ لگی سپیٹاں کھنک اٹھیں۔ اس نے ہاتھ بڑھا کے ماں کے ”پوشش“ کا دامن تھامنا چاہا۔

”ابھی نہیں میری لاڈلی، بس کچھ دیر اور.....“ ابا نے بھی نگاہوں میں تسلی دی۔

☆ ☆ ☆

”ماموں!“ وہ دئے ہوئے پتے پہ پہنچنے کے کچھ دیر کے لیے رکا۔ سر اٹھا کے اس سفید

نمارت کود دیکھ رہا تھا جس کے اندر ”وہ“ موجود تھی جب ایک اشتیاق بھری آواز پہ پلٹا۔ سبز

کاشن کے مسلے ہوئے سلوٹوں سے بھرے لباس میں ملبوس وہ کم عمری لڑکی اپنے سنہری

پیرہنے پہ بے پناہ اشتیاق لیے اس سے ہی مخاطب تھی۔

”مقدس؟“ اس نے سوجنا چاہا لیکن اس کی زردی مائل سبز آنکھوں کو دیکھ

کے خود ہی تردید کی تھی۔ تو کسی اور کی یا والدہ کی تھی۔ رحیم گل آفریدی کی.....

وہ چونکا۔

”ماموں!“ اب کے اس نے پورے دھیان سے اسے سنا اور اثبات میں سر ہلاتے

ہوئے اپنے بازو پھیلا دیئے۔

”ماموں!“ اس کے سینے سے لگتے ہوئے اس نے سرگوشی کی۔

”بس کچھ دیر اور..... چند لمحوں بعد وہ دونوں میرے سامنے ہوں گی۔“ اس کا

دل یہ سوچتے ہی اچھل اچھلنے لگا۔ یہ چند قدموں کا فاصلہ ایک ہی قدم میں طے کرنے پر

اس کا دل بھرتے ہوئے ایک ہی قدم کا فاصلہ رہ گیا تو وہ زک گیا۔

کبھی زردی اور میں ماربل کے پلر کے ساتھ ٹیک لگائے وہ بلاشبہ مقدس ہی تھی۔ اس نے

اس کے گرد بیروں کی کنیاں دکتی دیکھی تھیں۔ اگر اللہ ان آنکھوں میں نیلا نہیں

اتارنے کے بجائے شہد رنگ چشمے ٹھہرا دیتا تو کون پہچان پاتا یہ مومنہ ہے یا مقدس۔

”باباجان“ اس نے زریاب کے پھلے بازو دیکھے تو الجھ سی گئی۔ ذہن میں کہیں خوشنود

کے الفاظ نے سہارا دیا۔

”مزائیں دینے کا یہ عمل کب تک جاری رہے گا۔“ اس نے باپ کی پیاسی آغوش

میں جانے میں دیر نہ لگائی۔ ماں کی ممتا کو تسکین پہچانے میں اس نے جو بچکچاہٹ کا مظاہرہ

کیا تھا، اس کا خمیازہ وہ ایک کسک کی صورت بھگت رہی تھی۔ اس وقت اس کی ماں زندگی

کی آخری بازی کھیل رہی تھی۔ اور وہ باہر کھڑی اللہ سے بس ایک لمحہ مانگ رہی تھی۔ بس

ایک لمحہ جس میں وہ ماں کو جاتے جاتے اپنی محبت کا یقین دلا جائے۔ اندر خوشنود ڈاکٹر محمود کے ساتھ مل کے وہ ایک لمحہ بچانے کی کوشش کر رہا تھا۔ مومنہ کی بے ہوشی طویل ہو چکی تھی۔

”میں ایک بار اپنے سر پر باپ کے ہاتھ کا سایہ محسوس کرنا چاہتی ہوں۔ میں جانا چاہتی ہوں وہ ٹھنڈک کیسی ہوگی جو ان ہاتھوں تلے پھیلے چھاؤں میں ہے۔“

کچھ ہی روز قبل فجر کی نماز میں کی گئی دعا کے الفاظ اس کے چاروں طرف گونجنے لگے۔ سر پر رکھی زریاب خشک کی ہتھیلی سے ٹھنڈک اس کی پوری پور میں اترنے لگی۔ اسے اپنی دعا کے پورا ہونے کا یقین ہو گیا۔ وہ ایمان لے آئی کہ اس دعا کا دوسرا حصہ بھی ضرور پورا ہوگا۔

اس نے ڈبڈبائی آنکھوں سے باپ کے خدو خال میں وہ عکس ڈھونڈنا چاہا۔ وہ بچپن سے گھر میں لگی قد آدم تصاویر میں رہتی چلی آ رہی تھی۔ اس کے دل میں سزا دے پہلے لئے کا عم نمایاں تھا۔ چہرے پہ پچھتاؤں کی گہری لکیریں تھیں۔ وہ بچپن کی آنکھوں کے گرد جلتے تھے اور چوڑے شانے ڈھلکے ہوئے تھے۔

”مما تمہیں خزاؤں کے حوالے کر کے پھر بھی اجڑے ہی رہے ہیں۔“

”مقدس!“ کمرے سے نرس کے ہمراہ نکلتے ڈاکٹر خوشنود نے آواز دی۔

”فیروز!“ زریاب کو ایک اور جھٹکا لگا اور وہ لے چلی۔ اسے اس بوجھان کو دیکھنے لگا۔

”پھوپھی جان، ہوش میں آگئی ہیں۔“ مومنہ نے اسے دیکھا۔ اس کی سس بات سن کر جا سکتی، تم چاہو تو ان سے مل سکتی ہو۔“ اسے ایک دراز قامت مگر تھکے تھکے انسان کا ہاتھ تھام کے اندر جاتے دیکھ کر اس نے روکا۔

”تم اکیلی ان سے مل سکتی ہو مقدس۔ میں نے کہا ان کی حالت بہت بڑک ہے۔“ وہ کچھ کچھ پہچان رہا تھا۔

”بابا جان!“ اس نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا جاہا۔ جو اب زریاب کے ایک سرد آہ بھری۔

”کیا میرے نصیب میں پچھتاؤں سے رہائی نہیں لکھی۔ مقدس..... میری بیٹی اپنی ماں سے مجھے معافی دلا دو۔“ وہ ہاتھ جوڑ کے تقریباً بلک اٹھا۔

”میں تو مر بھی نہیں سکوں گا اگر اس نے مجھے معاف نہ کیا۔ مومنہ کی آتی جاتی اکھڑی سانسیں دیکھ کے مقدس تڑپ گئی۔ اس نے ماں کے برف ہوتے پیر تمام لیے۔

”مما.....“ مومنہ نے بمشکل آنکھیں کھولیں۔ اس کی آنکھوں کے دھندلے

ہوتے شیشوں پہ مسکراہٹ کا عکس جھلملایا۔ خوشی کی چمک نے اس کے زرد چہرے کو یکا یک جگمگا دیا۔ اس کے لبوں نے پھڑپھڑا کے اسے پکارنا چاہا لیکن وہ وہیں دو زانو بیٹھ کے اس کے پیر چومنے لگی۔

”میری پیاری ممما..... میری ممما مجھے معاف کر دیں مجھے معاف کر دیں میں نے آپ کو کتنا دکھ دیا۔ آپ بائیں پھیلا پھیلا کے مجھے بلاتی رہیں اور میں بے ثمر حسابوں میں کھوٹی رہی..... میں کتنی بد نصیب ہوں ماں کے ملنے کے بعد بھی اس کی قدر نہ کی۔“

اس کے آنسوؤں نے مومنہ کے پیر بھگو دیے۔ وہ بولنے کی سکت نہ رکھتی تھی۔ بدلت ہاتھ اٹھا کے اسے اپنے پاس بلا یا۔ وہ یوں بجلی کی طرح اس کے بازوؤں میں گئی جیسے اس کے ہاتھوں کا ایک پل بھی خراب نہ کرنا چاہتی۔ مومنہ نے کپکپاتے ہاتھوں میں اس کا جھکا چہرہ تمام لیے لیں۔ اس کے ماتھے پہ ایک دعا ثبت کر دی۔

”میں جانا چاہتی ہوں کپکپاتے لبوں کا وہ بوسہ کتنا حیات بخش ہوتا ہوگا جو اولاد کے ماتھے کا مقدر بنتا ہے۔ میں جانا چاہتی ہوں وہ گرمی کتنی پرسکون ہوگی جو ماں کی بانہوں کی پناہ میں ہے۔“

”میں نے دعا کی کہ وہ بوسہ بھی پورا ہو گیا تھا۔ اسے اپنی دعا کا وہ آخری جملہ یاد آ رہا۔ بس تجھ کو سنبھالیں..... یا اللہ ذرا سی گرمی۔ بس اک بوسہ یا اللہ بس اک بوسہ۔“ وہ کانپ گئی۔

”کیوں میں نے نہیں ایک دعا کی طلب کی؟ کیوں میں نے بس ایک بوسے کی، ذرا سی گرمی کی خواہش کی۔“

”بس ایک بوسہ تو نہیں۔“ وہ خوفزدہ ہو کر ماں کو پکارنے لگی۔

”مما.....“ ماما آنکھیں کھولیں آپ نے پھر سے آنکھیں کیوں بند کر لیں۔ دیکھیں ممما باہر کون آیا ہے..... بابا جان آئے ہیں آپ کے پاس خود چل کے آئے ہیں اپنی تمام غلطیوں کا اعتراف کرنے۔ آپ کی ہر بات کی سچائی پہ ایمان لانے کے لیے

آنکھیں ماما پلیز ان سے مل لیں۔ ایک بار مل لیں وہ شرمندہ ہیں، ہارے ہوئے ہیں، انہیں اپنی زیادتیوں کا احساس ہو گیا ہے۔ آپ بھی ان کی سزا معاف کر دیں ممما۔“

”مما خدا کے لیے..... میری خاطر اب تو اپنے دل کو نرم کر لیجئے۔ معاف کر دیں انہیں۔ خدا بھی بڑی سے بڑی خطا معاف کر دیتا ہے اور معاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ انہیں آپ کی پاکیزگی کا یقین ہے۔ آپ کو اور کیا چاہیے۔ بس کریں اپنے دل کو جلا نا..... بس کریں یہ نفرت کا کھیل، نکال پھینکیں اپنے دل سے یہ کالے پھول.....“ اس

کے مسلسل اصرار پہ مومن نے ہار مان لی۔ اس کے لبوں پہ ایک بے بس خاموشی تھی۔
 ”مومنہ!“ زریاب نے پکارا۔ اس کے چہرے کے بدلے نقوش دکھ کے اس کے
 دل پہ گھونسا پڑا۔ پچھلے دنوں میں اس نے بڑی سے بڑی اندوہناک خبر سنی تھی کئی حادثے
 جمیل لیے تھے لیکن..... لیکن اس گلابی ریشمی چہرے کی جگہ ادھ جلاسا نولا پڑتا زرد چہرہ
 دکھ کے اس کے دل پہ جو قیامت گزری تھی وہ سب سے اذیت ناک تھی۔

”اور کیا ان اندھیرے درپہوں کے پیچھے اب بھی شہید کی جمیل آباد ہے۔“
 ”مومنہ! ایک بار تم نے پوچھا تھا۔ پھولوں کے رنگ کا کسے کیسے ہو جانتے ہیں۔ میں
 صحیح طریق بتانا چاہتا تھا، شاید شب میں جا رہا ہوں نہیں تھا۔ آج میں تمہارے سوال کا جواب
 دینے کے قابل ہوں۔ سنو مومنہ، پھولوں کے رنگ کا لے نہیں دوتے..... پھول کبھی کالے

نہیں ہوتے، کالک تو دلوں پہ لگتی ہے، مومنہ! تو یہ تو تمہارا کیا تر جاتی ہے۔ اندھیرے
 تو نظروں پہ چھا چاہتے ہیں، اتنی تاریکی میں جو بھی دیکھو کالا ہی لگتا ہے۔ ایسے ہی
 اندھیرے میں کئی چاٹ گئے تھے۔ میرے دل سے نقل یہ، شوہر ہر جگہ سیاہی میں دی گئی
 اسی لیے مجھے تمہارا دامن کالا نظر آیا۔ لیکن تم میرا کیسے ہو سکتی تھیں۔ پھول کبھی کالے نہیں
 دوتے۔ کبھی کبھی ہوتے۔“ مومنہ نے کہا۔ اس کے دل میں اس وقت جو درد تھا وہ اس کے وجود
 میں اب بھی وہ درد کو جان لینے کی دھڑکن میں رہتا تھا۔

”مومنہ... مومنہ“ وہ وحشت زدہ سا چلا اٹھا۔ مقدس اور خوشنود اس کی آنکھوں کی
 گونج سے چونک کر اندر کی طرف لپکے۔
 ”مومنہ! تم ایسے نہیں جا سکتیں۔ تم مجھے معاف کیے بغیر کیسے جا سکتی ہو۔ تم مجھے اتنی
 لمبی سزا کیسے سنا سکتی ہو۔ تم اتنی پھر دل سے بوسہ کی ہو مومنہ، مومنہ! تمہیں خدا کا واسطہ لوت
 آؤ۔ مجھے اس قید سے نجات دلا دو۔ اس سنگباری کو روکو اور۔“

وہ گر پڑا تھا اور اس کے بے جان وجود سے رحم کی بھیک مانگ رہا تھا۔ مقدس نے
 آنسوؤں سے تر چہرے کے ساتھ آگے بڑھ کے ماں کے ماتھے پہ ہاتھ رکھا۔

”تمہارے اندر کی عورت جیت گئی ماں، تم مر گئیں، لیکن تم نے اپنی نفرت مرنے نہ
 دی۔ شاید یہی نفرت تمہاری زندگی تھی لیکن میں جانتی ہوں تم بزدل تھیں۔ تم خود کو جتنا
 مرضی کٹھور ثابت کرو تم ایک بزدل عورت تھیں۔ اس بزدلی نے تمہیں مرنے پہ مجبور کیا۔
 اگر زندہ رہتیں تو نفرت مر جاتی۔ ہے ناں ماں؟ سچ سچ ہوا تمہاری نفرت مرنے لگی تھی

ناں؟“
 ختم شد